مقدمہ

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

علامہ شبلی نعمانیؒ

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ (ہند) ۲۷۶۰۰۱

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا إِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْا (الآية)

مقدّمہ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

سیرۃ النبیؐ کے اس شاہکار مقدمہ میں روایت و درایت کے اصول اور فن سیرت کی کتابوں کی تاریخ و کیفیت بیان کی گئی ہے اور ان پر نقد و تبصرہ کیا گیا ہے۔

تالیف

علامہ شبلی نعمانیؒ

دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی۔ پوسٹ باکس نمبر ۱۹ - اعظم گڈھ ۲۷۶۰۰۱ (ہند)

سلسلہ مطبوعات دارالمصنفین نمبر : ۱۸۵

نام کتاب	:	مقدمہ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم
مصنف	:	علامہ شبلی نعمانیؒ
صفحات	:	۶۸+۶=۷۴
اڈیشن	:	ستمبر ۱۹۹۹ء
مطبع	:	منارک آفسیٹ پریس، جونپور۔
ناشر	:	دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڈھ۔ (یوپی)۔ انڈیا
قیمت	:	30/-

باہتمام

عبد المنان ہلالی

فہرست مضامین

مقدمہ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

الحمد للہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علی رسولہ الکریم محمدن الامین وعلی آلہ واصحابہ اجمعین۔

سیرۃ النبی دارالمصنفین کی سب سے مشہور و مایہ ناز تصنیف ہے، یہ علامہ شبلیؒ کی زندگی کی آخری مگر سب سے اہم یادگار ہے۔ انہوں نے اس کی تالیف کا آغاز تقریباً سو برس پہلے کیا تھا، مگر اس کی مقبولیت اور تر و تازگی میں ابھی تک کوئی فرق نہیں آیا ہے۔

سیرۃ النبی کو اس کی جن گوناگوں خصوصیات نے منفرد اور ممتاز بنایا ہے، ان میں اس کے عالمانہ و محققانہ مقدمہ کو بھی خاص دخل ہے۔ اسی لئے بعض اہلِ نظر نے توجہ دلائی کہ اس کو سیرۃ النبی کے ساتھ شائع کرنے کے علاوہ علحدہ بھی طبع کرایا جائے کیوں کہ یہ سیرت کا جز بھی ہے اور فن سیرت کے اہم اصولی مباحث پر مشتمل ہونے کی وجہ سے ایک مستقل تصنیف بھی ہے۔

حال ہی میں سیرۃ النبی کی تمام جلدوں کو از سر نو حوالوں کی تحقیق و مراجعت کے بعد صحت کے ساتھ شائع کرنے کا منصوبہ بنایا گیا تو اس کے مقدمہ کو علحدہ کتابی صورت میں شائع کرنے کا فیصلہ بھی کیا گیا تاکہ جو لوگ کسی وجہ سے سیرت کی ضخیم جلدوں کا مطالعہ نہ کر سکیں وہ کم از کم اس کے مقدمہ کو پڑھ کر اسکی عظمت و خصوصیت اور فن سیرت کے اصولی مباحث سے واقف ہوجائیں۔ وماتوفیقی الا باللہ العزیز الحکیم۔

ناچیز

ضیاء الدین اصلاحی

۲۱/ستمبر ۱۹۹۹ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

(فن روایت)

الحمد للہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علی رسولہ محمد والہ واصحابہ اجمعین ۔

سیرۃ نبویؐ کی تالیف کی ضرورت عالم کائنات کا سب سے بڑا مقدم فرض اور سب سے زیادہ مقدس خدمت یہ ہے کہ نفوس انسانی کے اخلاق کی اصلاح و تکمیل کی جائے۔ یعنی پہلے ہر قسم کے فضائلِ اخلاق، زہد و تقویٰ عصمت و عفاف، احسان و کرم، حلم و عفو، عزم و ثبات، ایثار و لطف، غیرت و استغنا کے اصول و فروع نہایت صحیح طریقہ سے قائم کیے جائیں اور پھر تمام عالم میں ان کی عملی تعلیم رائج کی جائے۔

اس مقصد کے حصول کا عام طریقہ وعظ و پند ہے۔ اس سے زیادہ متمدن طریقہ یہ ہے کہ فن اخلاق میں اعلیٰ درجہ کی کتابیں لکھی جاکر تمام ملک میں پھیلائی جائیں اور لوگوں کو ان کی تعلیم دلائی جائے۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ لوگوں سے بہ جبر محاسنِ اخلاق کی تعمیل کرائی جائے اور رذائل سے روکے جائیں۔

یہی طریقے ہیں جو ابتدا سے آج تک تمام دنیا میں جاری ہیں اور آج اس انتہائی ترقی یافتہ دور میں بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن سب سے زیادہ صحیح، سب سے زیادہ کامل، سب سے زیادہ عملی طریقہ یہ ہے کہ نہ زبان سے کچھ کہا جائے نہ تحریری نقوش پیش کئے جائیں، نہ جبر و زور سے کام لیا جائے۔ بلکہ فضائلِ اخلاق کا ایک پیکرِ مجسم سامنے آجائے۔ جو خود ہمہ تن آئینۂ عمل ہو۔ جس کی ہر جنبشِ لب ہزاروں تصنیفات کا کام دے اور جس کا ایک ایک اشارہ اوامرِ سلطانی بن جائے۔ دنیا میں آج اخلاق کا جو سرمایہ ہے، سب انہی نفوسِ قدسیہ کا پر تو ہے۔ دیگر اور اسباب صرف ایوانِ تمدن کے نقش و نگار ہیں۔

پیغمبروں پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت

لیکن اس وقت تک دنیا کی جس قدر تاریخ معلوم ہے، اس نے اس قسم کے نفوس قدسیہ جو پیش کئے ہیں، وہ فضائل اخلاق کی کسی خاص صنف کے نمونے تھے، مثلاً جناب مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مکتب درس میں صرف حلم و تحمل، صلح و عفو، قناعت و تواضع کی تعلیم ہوتی تھی، حکومت و فرمانروائی کے لئے جو فضائل اخلاق درکار ہیں، مسیحی تعلیم کی بیاض میں ان سطروں کی جگہ سادی ہے، حضرت موسیٰ اور نوح علیہما السلام کے اوراق تعلیم میں عفو عام کے صفحے خالی ہیں، اس بنا پر ہر ہر قدم پر نئے نئے رہنما کی ضرورت پیش آئی، اور اس لئے عالم انسانی اپنی تکمیل کے لئے ہمیشہ ایسے جامع کامل (۱) کا محتاج رہا جو صاحب شمشیر و نگین بھی ہو اور گوشہ نشین بھی، بادشاہ کشور کشا بھی ہو اور گدا بھی، فرمانروائے جہان بھی ہو اور سبحہ گرداں بھی، مفلس قانع بھی ہو اور غنی دریادل بھی، یہ برزخ کامل، یہ ہستی جامع، یہ صحیفہ یزدانی عالم کون کی آخری معراج ہے،

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ (مائدہ۔۵:۳)

عالم فانی کی کوئی چیز ابدی نہیں، اس لئے یہ ہستی جامع دنیا میں آکر ہمیشہ نہیں رہ سکتی، اس لئے ضرور ہے کہ اس کی زبان کا ایک ایک حرف، اس کی حرکات و سکنات کی ایک ایک ادا، اس کے حلیہ وجود کے ایک ایک خط و خال کا عکس لے لیا جائے کہ مراحل زندگی میں جہاں ضرورت

---

(۱) یہاں پر کتاب کی اس عبارت بالا کے مخاطب اہل کتاب ہیں جن کے موجودہ صحیفوں میں ان انبیاء کے جو احوال مذکور ہیں وہ اسی صورت میں ہیں، اس لئے مصنف نے ان کے بیان کردہ تمام احوال کو مان کر ایک باکمال اور ہمہ کمال ہستی کی ضرورت پر ان کے سامنے حجت قائم کی ہے۔

لیکن چونکہ ازروے اسلام ایک طرف تمام انبیاء علیہم السلام کی صداقت پر یکساں ایمان لانا اور ان کو تمام پیغمبرانہ کمالات سے متصف جاننا ضروری ہے، جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے،

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهِ (البقرہ۔۲:۲۸۵) ہم اس کے رسولوں میں سے کسی کے درمیان تفریق نہیں کرتے۔

اس لئے یہ ضروری ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام کو یکساں صادق اور کمالات نبوت سے متصف مانا جائے، دوسری طرف ارشاد ہے:

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ مِّنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ (البقرہ۔۲:۲۵۴)

یہ حضرات مرسلین ایسے ہیں کہ ہم نے ان میں سے بعضوں کو بعضوں پر فوقیت بخشی ہے (مثلاً) بعضے ان میں وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوئے ہیں (یعنی موسیٰ علیہ السلام) اور بعضوں کو ان میں سے بہت سے درجوں پر سرفراز کیا اور ہم نے حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کو کھلے کھلے دلائل عطا فرمائے اور ہم نے ان کی تائید روح القدس یعنی جبریل سے فرمائی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے مراتب کمالیہ میں جزئی تفاوت بھی ہے، ان دونوں صداقتوں کے درمیان تطبیق کے لئے تھوڑی تشریح کی ضرورت ہے۔

حضرات انبیاء علیہم السلام تمام کمالات نبوت و فضائل اخلاق سے یکساں سرفراز تھے، مگر زمانہ اور ماحول کے ضروریات

پیش آئے، رہنمائی کے کام آئے، لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ جس طرح دیگر تمام داعیان مذہب جامعیت کبریٰ کے وصف سے خالی تھے، ان کے کارنامۂ زندگی کی تصویریں بھی ناتمام لی گئیں۔ جناب مسیحؑ کی ۳۳ سالہ زندگی میں صرف ۳ برس کے حالات معلوم ہیں، فارس کے مصلحان دین صرف شاہنامہ کے ذریعہ سے روشناس ہیں، ہندوستان کے پیغمبر، افسانوں کے حجاب میں گم ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نسبت آج جو کچھ معلوم ہے اس کا ذریعہ صرف موجودہ توراۃ ہے جو حضرت موسیٰ کے ۳۰۰ برس بعد عالم وجود میں آئی، یہ قدرت کی طرف سے اشارہ تھا، کہ ان کے کارنامے اور اصول تعلیم ابدی نہ تھے، اس لئے نقل و روایت کے آئینہ میں جس قدر ان کا ناتمام عکس اترا، اس سے زیادہ ضروری بھی نہ تھا، قدرت خود ضرورت کی اندازہ داں ہے، اور جب جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے وہ خود مہیا کر دیتی ہے۔

تمام ارباب مذاہب میں سے ہر ایک کو اپنا مذہب اسی قدر عزیز ہے، جس قدر دوسرے کو ہے، اس لئے اگر بے پردہ یہ سوال کیا جائے کہ دنیا میں کون ہستی تھی جس میں جامعیت کبریٰ کا وصف نمایاں تھا،؟ تو ہر طرف سے مختلف صدائیں آئیں گی، لیکن اگر یہی سوال اس پیرایہ میں بدل دیا جائے، کہ دنیا میں وہ کون شخص گذرا ہے جس کا کارنامۂ زندگی اس طرح قلمبند ہوا کہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲) اور مصلح الہی کی بنا پر ان تمام کمالات کا عملی ظہور، تمام انبیاءؑ میں یکساں نہیں ہوا بلکہ بعض کے بعض کمالات اور دوسروں کے دوسرے کمالات زیادہ نمایاں ہوئے یعنی جس زمانہ کے حالات کے لحاظ سے جس کمال کے اظہار کی ضرورت ہوئی وہ پوری شدت سے ظاہر ہوا، اور دوسرے کمال کا جس کی اس وقت ضرورت پیش نہیں آئی، بہ مصلحت یہ کمال ظہور نہیں ہوا۔

حاصل یہ ہے کہ ہر کمال کے ظہور کے لئے مناسب موقع و محل کی ضرورت ہوتی ہے، اگر کسی عارض کی وجہ سے کسی کمال کا ظہور نہ ہو تو اس سے نفس کمال کے وجود کی نفی نہیں ہوتی ہے، اس لئے اگر بوجہ عدم ضرورت حال ان انبیائے کرامؑ کے بعض کمالات کا عملی ظہور کسی وقت میں نہیں ہوا تو اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ یہ حضرات (نعوذ باللہ) ان کمالات و فضائل سے متصف نہ تھے۔

غزوہ بدر کے قیدیوں کے باب میں حضرت ابو بکر صدیقؓ نے جب فدیہ لے کر ان کو چھوڑ دینے کا اور حضرت عمرؓ نے ان کے قتل کا مشورہ دیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکر صدیقؓ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ اللہ تعالی نے شدت و رحمت میں لوگوں کے قلوب مختلف بنائے ہیں، اے ابو بکر تمہاری مثال ابراہیمؑ و عیسیٰؑ کی اور اے عمر تمہاری مثال نوحؑ اور موسیٰؑ کی ہے، یعنی ایک فریق سے رحم و کرم کا اور دوسرے سے شدت کا اظہار ہوا، (دیکھئے مستدرک حاکم غزوۂ بدر)

اس حدیث میں اسی نقطۂ اختلاف کی طرف اشارہ ہے، جو انبیاء علیہم السلام کے مختلف احوال مبارکہ میں رونما رہا ہے، لیکن حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت چونکہ آخری اور عمومی تھی، اس لئے بہ ضرورت احوال آپؐ کے تمام کمالات آپؐ کی زندگی میں عملاً پوری طرح جلوہ گر ہوئے، اور آپؐ کی نبوت کے آفتاب عالمتاب کی ہر کرن دنیا کے لئے مشعل ہدایت بنی، اور ظلمتکدہ عالم کا ہر گوشہ آپؐ کے ہر قسم کے کمالات کے ظہور سے پر نور ہوا، صلی اللہ علیہ وسلم، اس موقع پر یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ ان جزئی کمالات کے اظہار میں ایسا پہلو نعوذ باللہ پیدا نہ ہونے پائے، جس سے دوسرے انبیاء علیہم السلام کی توہین یا کسر شان پیدا ہو اس سے ایمان کے ضائع جانے کا خطرہ ہے۔

مزید تفصیل کے لئے دیکھئے (معارف محرم و صفر ۵۶ ۱۳ھ میں مضمون "خلیل کی بشریت") س-س

ایک طرف تو صحت کا یہ انتظام تھا کہ کسی صحیفۂ آسمانی کے لئے بھی نہ ہو سکا، اور دوسری طرف وسعت اور تفصیل کے لحاظ سے یہ حالت ہے کہ اقوال و افعال، وضع و قطع، شکل و شباہت، رفتار و گفتار، مذاق طبیعت، انداز گفتگو، طرز زندگی، طریق معاشرت کھانے پینے، چلنے پھرنے، اٹھنے بیٹھنے، سونے جاگنے، ہنسنے بولنے کی ایک ایک ادا محفوظ رہ گئی، تو اس سوال کے جواب میں صرف ایک صدا بلند ہو سکتی ہے، (محمد عربی فدیتہ بابی و امی)

سیرت کی ضرورت علمی حیثیت سے

یہ جو کچھ کہا گیا، مقصد تصنیف کا مذہبی پہلو تھا، اسی مسئلہ کو علمی حیثیت سے دیکھو، علوم و فنون کی صف میں سیرت (بیاگرفی) کا ایک خاص درجہ ہے، ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی کے حالات زندگی بھی حقیقت شناسی اور عبرت پذیری کے لئے دلیل راہ ہیں، چھوٹے سے چھوٹا انسان بھی کیسی عجیب خواہشیں رکھتا ہے کیا کیا منصوبے باندھتا ہے، اپنے چھوٹے سے دائرہ عمل میں کس طرح آگے بڑھتا ہے کیونکر ترقی کے زینوں پر چڑھتا ہے، کہاں کہاں ٹھوکریں کھاتا ہے، کیا کیا مزاحمتیں اٹھاتا ہے، تھک کر بیٹھ جاتا ہے، سستاتا ہے، اور پھر آگے بڑھتا ہے، غرض سعی و عمل، جد و جہد، ہمت و غیرت کی جو عجیب و غریب نیرنگیاں سکندر اعظم کے کارنامۂ زندگی میں موجود ہیں، بعینہٖ یہی منظر ایک غریب مزدور کے عرصۂ حیات میں بھی نظر آتا ہے۔

اس بنا پر اگر سیرت اور سوانح کا فن عبرت پذیری اور نتیجہ رسی کی غرض سے درکار ہے تو "شخص" کا سوال نظر انداز ہو جاتا ہے، صرف یہ دیکھنا رہ جاتا ہے کہ حالات اور واقعات جو ہاتھ آتے ہیں، وہ کس وسعت اور استقصاء و تفصیل کے ساتھ ہاتھ آتے ہیں، تاکہ مراحل زندگی کی تمام راہیں اور ان کے پیچ و خم ایک ایک کر کے نظر کے سامنے آجائیں، لیکن اگر خوش قسمتی سے فرد کامل، اور استقصائے واقعات دونوں باتیں جمع ہو جائیں، تو اس سے بڑھ کر اس فن کی کیا خوش قسمتی ہو سکتی ہے۔

وجوہ مذکورہ بالا کی بنا پر کون شخص انکار کر سکتا ہے کہ صرف ہم مسلمانوں کو نہیں، بلکہ تمام عالم کو اس وجود مقدس کی سوانح عمری کی ضرورت ہے، جس کا نام مبارک "محمد" (رسول اللہ) ہے، اللھم صل علیہ و سلم صلوۃ کثیرۃ یہ ضرورت صرف اسلامی یا مذہبی ضرورت نہیں ہے، بلکہ ایک علمی ضرورت ہے، ایک اخلاقی ضرورت ہے، ایک تمدنی ضرورت ہے، ایک ادبی ضرورت ہے، اور مختصر یہ کہ مجموعہ ضروریات دینی و دنیوی ہے۔

میں اس بات سے ناواقف نہ تھا کہ اسلام کی حیثیت سے میرا فرض اولین یہی تھا کہ تمام تصنیفات سے پہلے میں سیرۃ نبویؐ کی خدمت انجام دیتا، لیکن یہ ایک ایسا اہم اور نازک فرض تھا کہ میں مدت تک اس کے ادا کرنے کی جراءت نہ کر سکا تاہم میں دیکھ رہا تھا کہ اس فرض کے ادا کرنے کی ضرورتیں بڑھتی جاتی ہیں۔

علم کلام کی حیثیت سے سیرت کی ضرورت

اگلے زمانہ میں سیرۃ کی ضرورت، صرف تاریخ اور واقعہ نگاری کی حیثیت سے تھی، علم کلام سے اس کو واسطہ نہ تھا، لیکن معترضین حال کہتے ہیں کہ اگر مذہب صرف خدا کے اعتراف کا نام ہے تو بحث یہیں تک رہ جاتی ہے، لیکن جب اقرار نبوت بھی جزو مذہب ہے تو یہ بحث پیش آتی ہے کہ جو شخص حامل وحی اور سفیر الٰہی تھا، اس کے حالات، اخلاق اور عادات کیا تھے؟

یورپ کے مورخین آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جو اخلاقی تصویر کھینچتے ہیں، وہ (نعوذ باللہ) ہر قسم کے معائب کا مرقع ہوتی ہے، آج کل مسلمانوں کو جدید ضرورتوں نے عربی علوم سے بالکل محروم کر دیا ہے، اس لئے اس گروہ کو اگر کبھی پیغمبر اسلامؐ کے حالات اور سوانح کے دریافت کرنے کا شوق ہوتا ہے تو انہی یورپ کی تصنیفات کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے، اس طرح یہ زہر آلود معلومات آہستہ آہستہ اثر کرتی جاتی ہیں، اور لوگوں کو خبر تک نہیں ہوتی، یہاں تک کہ ملک میں ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا ہے، جو پیغمبرؐ کو محض ایک مصلح سمجھتا ہے، جس نے اگر مجمع انسانی میں کوئی اصلاح کر دی تو اس کا فرض ادا ہو گیا، اس بات سے اس کے منصب نبوت میں فرق نہیں آتا، کہ اس کے دامن اخلاق پر معصیت کے دھبے بھی ہیں۔

یہ واقعات تھے جنہوں نے مجھ کو بالآخر مجبور کیا، اور میں نے سیرۃ نبویؐ پر ایک مبسوط کتاب لکھنے کا ارادہ کر لیا، یہ کام بظاہر نہایت آسان تھا، عربی زبان میں سینکڑوں کتابیں موجود ہیں، ان کو سامنے رکھ کر ایک ضخیم اور دلچسپ کتاب لکھ دینا زیادہ سے زیادہ چند مہینوں کا کام تھا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ کوئی تصنیف اس تصنیف سے زیادہ دیر طلب اور جامع مشکلات نہیں ہو سکتی۔

سیرت اور حدیث میں فرق

آگے چل کر ہم تفصیل سے بیان کریں گے کہ خاص سیرت (۱) پر آج تک کوئی ایسی کتاب نہیں لکھی گئی، جس میں صرف صحیح روایتوں کا التزام کیا جاتا، حافظ زین الدین عراقی جو حافظ ابن حجر کے استاد تھے، سیرۃ نبویؐ میں لکھتے ہیں،

ولیعلم الطالب ان السیرا تجمع ما صح وما قد انکرا

یعنی طالب فن کو جاننا چاہیئے کہ سیرۃ میں ہر قسم کی روایتیں نقل کی جاتی ہیں صحیح بھی اور قابل انکار بھی۔

---

(۱) اس موقع پر ایک نہایت ضروری بحث طے کر دینے کے قابل ہے، جو آج کل کی قلت علم اور ناآشنائی فن نے پیدا کر دی ہے، بہت سے لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ سیرت فن حدیث ہی کی ایک خاص قسم کا نام ہے، یعنی احادیث میں سے وہ واقعات الگ لکھ دیئے گئے، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق وعادات سے متعلق ہیں، تو یہ سیرت بن گئی، اور چونکہ حدیث میں متعدد کتابیں ایسی موجود ہیں جن میں ایک حدیث بھی ضعیف نہیں، مثلاً صحیح بخاری، مسلم، تو یہ کہنا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے کہ سیرت میں کوئی کتاب آج تک صحت کے التزام کے ساتھ نہیں لکھی گئی، اس بحث کے ذہن نشین کرنے کے لئے امور ذیل پیش نظر رکھنے چاہئیں۔

(۱) پہلی بحث یہ ہے کہ سیرت کا اطلاق کس چیز پر ہوتا ہے، محدثین اور ارباب رجال کی اصطلاح قدیم یہ ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خاص غزوات کو مغازی اور سیرت کہتے تھے، چنانچہ ابن اسحاق کی کتاب کو مغازی بھی کہتے ہیں اور

یہی سبب ہے کہ مستند اور مسلم الثبوت تصنیفات میں بھی بہت سی ضعیف روایتیں شامل ہو گئیں، اس بنا پر ضرور تھا کہ نہایت کثرت سے حدیث و رجال کی کتابیں بہم پہنچائی جائیں، اور پھر نہایت تحقیق اور تنقید سے ایک مستند تصنیف تیار کی جائے، لیکن سینکڑوں کتابوں کا استقصاء

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵) سیرت بھی، حافظ ابن حجر فتح الباری کتاب المغازی میں یہ دونوں نام ایک ہی کتاب کے لئے استعمال کرتے ہیں، فقہ کی بھی یہی اصطلاح ہے، فقہ میں جو باب کتاب الجہاد والسیر باندھتے ہیں، اس میں سیرت کے لفظ سے غزوات اور جہاد کے احکام مراد ہوتے ہیں۔

کئی صدی تک یہی طریقہ رہا چنانچہ تیسری صدی تک جو کتابیں سیرت کے نام سے مشہور ہیں مثلاً سیرت ابن ہشام، سیرت ابن عائذ، سیرت اموی وغیرہ ان میں زیادہ تر غزوات ہی کے حالات ہیں البتہ زمانہ مابعد میں مغازی کے سوا اور اور چیزیں بھی داخل کرلی گئیں، مثلاً مواہب لدنیہ میں غزوات کے علاوہ سب کچھ ہے۔

اس بنا پر محدثین کی اصطلاح میں مغازی اور سیرت عام فن حدیث سے ایک الگ چیز ہے، یہاں تک کہ بعض موقعوں پر ارباب سیر اور محدثین دو مقابل کے گروہ سمجھے جاتے ہیں، بعض واقعات کے متعلق یہ صورت پیدا ہوتی ہے کہ تمام ارباب سیر ایک طرف ہوتے ہیں، اور امام بخاری و مسلم ایک طرف، ایسے موقع پر بعض لوگ امام بخاری کی روایت کو اس بنا پر تسلیم نہیں کرتے، کہ تمام ارباب سیر کے خلاف ہے، لیکن محققین کہتے ہیں کہ حدیث صحیح تمام ارباب سیر کی متفقہ روایت کے مقابلہ میں بھی قابل ترجیح ہے، ہم اس موقع پر ایک دو واقعہ مثال کے طور پر لکھتے ہیں۔

غزوات میں ایک غزوہ ذو قرد کے نام سے مشہور ہے، اس کی نسبت ارباب سیر متفق ہیں کہ صلح حدیبیہ سے قبل واقع ہوا تھا، لیکن صحیح مسلم میں سلمہ بن الاکوع سے جو روایت ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صلح حدیبیہ کے بعد اور خیبر سے تین دن قبل کا واقعہ ہے اس حدیث کی شرح میں علامہ قرطبی نے لکھا ہے،

لایختلف اھل السیر ان غزوۃ ذی قرد کانت قبل الحدیبیۃ فیکون ما وقع فی حدیث سلمۃ من وھم بعض الرواۃ

اہل سیر میں سے کسی کو اس امر میں اختلاف نہیں ہے کہ غزوہ ذی قرد، حدیبیہ سے پہلے واقع ہوا تھا، تو سلمہ کی حدیث میں جو مذکور ہے وہ کسی راوی کا وہم ہوگا۔

حافظ ابن حجر فتح الباری (ذکر غزوہ ذی قرد) میں قرطبی کے اس قول پر بحث کر کے لکھتے ہیں،

فعلی ھذا ما فی الصحیح من التاریخ لغزوۃ ذی قرد اصح مما ذکرہ اھل السیر

تو اس بنا پر صحیح (مسلم) میں غزوہ ذی قرد کی جو تاریخ مذکور ہے وہ اس سے زیادہ صحیح ہے، جو مصنفین سیرت نے بیان کی ہے۔

دمیاطی ایک مشہور محدث ہیں انہوں نے سیرت میں ایک کتاب لکھی ہے، جو آج بھی موجود ہے اس میں انہوں نے اکثر موقعوں پر ارباب سیر کی روایت کو ترجیح دی تھی، لیکن جب زیادہ تتبع کیا تو ان کو معلوم ہوا کہ احادیث صحیحہ کو سیرت کی روایتوں پر ترجیح ہے چنانچہ اپنی کتاب میں ترمیم کرنی چاہی، لیکن اس کے نسخے کثرت سے شائع ہو گئے تھے، اس لئے نہ کر سکے۔ حافظ ابن حجر خود دمیاطی کا قول نقل کر کے لکھتے ہیں،

ودل ھذا علی انہ کان یعتقد الرجوع عن کثیر مما وافق فیہ اھل السیر وخالف الاحادیث الصحیحۃ وان

اور اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ وہ (یعنی دمیاطی) قصد کر چکے تھے کہ جن موقعوں پر انہوں نے ارباب سیرت سے اتفاق کر کے احادیث صحیحہ کی مخالفت کی ہے ان سے رجوع کریں گے اور

کے ساتھ دیکھنا، اوران سے معلومات کا اقتباس کرنا ایک شخص کا کام نہ تھا، اس کے ساتھ ایک ضرورت یہ بھی تھی کہ یورپ میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے، اس سے واقفیت حاصل کی جائے، میں بد قسمتی سے یورپ کی کوئی زبان نہیں جانتا، اس لئے ایک محکمۂ تصنیف کی ضرورت تھی، جس میں قابل عربی داں اور مغربی زبانوں کے جاننے والے شامل ہوں، خدا نے جب یہ سامان پیدا کر دیئے، تو اب مجھ کو کیا عذر ہو سکتا تھا، اب بھی اگر اس فرض کے ادا کرنے سے قاصر رہتا تو اس سے بڑھ کر کیا بد قسمتی ہو سکتی تھی۔

مسلمانوں کے اس فخر کا قیامت تک کوئی حریف نہیں ہو سکتا کہ انہوں نے اپنے پیغمبرؐ کے حالات اور واقعات کا ایک ایک حرف اس استقصاء کے ساتھ محفوظ رکھا کہ کسی شخص کے حالات آج تک اس جامعیت اور احتیاط کے ساتھ قلمبند نہیں ہو سکے، اور نہ آئندہ توقع کی جا سکتی ہے، اس سے زیادہ کیا عجیب بات ہو سکتی ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے افعال اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶)

ذالک کلہ بہ قبل تضلعہ منہا و لخروج نسخ کتابہ و انتشارہ لم یتمکن من تغیرہ (زرقانی بر مواہب جلد ۲ ص ۱۱)

یہ کہ یہ امران سے مہارت فن کے قبل صادر ہوا، لیکن چونکہ کتاب کے نسخے شائع ہو چکے تھے، اس لئے وہ اپنی کتاب کی اصلاح نہ کر سکے۔

(۲) ایک غزوہ ذات الرقاع کے نام سے مشہور ہے اس کی نسبت اکثر ارباب سیر کا اتفاق ہے کہ جنگ خیبر کے قبل واقع ہوا تھا لیکن امام بخاری نے تصریح کی ہے کہ خیبر کے بعد واقع ہوا، اس پر علامہ دمیاطی نے بخاری کی روایت سے اختلاف کیا، حافظ ابن حجر فتح الباری میں لکھتے ہیں۔

واماشیخہ الدمیاطی فادعی غلط الحدیث الصحیح وان جمیع اھل السیر علی خلافہ (فتح الباری جزء ہفتم صفحہ ۳۲۲)

باقی ان کے شیخ دمیاطی تو انہوں نے حدیث کی نسبت غلطی کا دعویٰ کیا ہے اور یہ کہ تمام اہل سیر بالاتفاق اس کے خلاف ہیں۔

حافظ ابن حجر نے اس قول کو نقل کر کے اس کا رد بھی کیا ہے۔

اس تقریر کا ماحصل یہ ہے کہ سیرت ایک جداگانہ فن ہے اور بعینہ فن حدیث نہیں ہے اور اس بنا پر اس کی روایتوں میں اس درجہ کی شدت احتیاط ملحوظ نہیں رکھی جاتی، جو فن صحاح ستہ کے ساتھ مخصوص ہے، اس کی مثال یہ ہے کہ فقہ کا فن قرآن اور حدیث ہی سے ماخوذ ہے، لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ بعینہ قرآن یا حدیث ہے یا ان دونوں کے ہم پلہ ہے۔

(۳) مغازی اور سیرت میں جس قسم کی جزئی تفصیلیں مقصود ہوتی ہیں، وہ فن حدیث کے اصلی بلند معیار کے موافق نہیں مل سکتیں، اس سے ارباب سیر کو تنقید اور تحقیق کا معیار کم کرنا پڑتا ہے، اس بنا پر سیرت و مغازی کا رتبہ فن حدیث سے کم رہا۔

(۴) جس طرح امام بخاری و مسلم نے یہ التزام کیا کہ کوئی ضعیف حدیث بھی اپنی کتاب میں درج نہ کریں گے، اس طرح سیرۃ کی تصنیفات میں کسی نے یہ التزام نہیں کیا، آج بیسیوں کتابیں قدما سے لے کر متاخرین تک کی موجود ہیں، مثلاً سیرت ابن اسحاق، سیرت ابن ہشام، سیرت ابن سید الناس، سیرت دمیاطی، حلبی، مواہب لدنیہ، کسی میں یہ التزام نہیں۔

تفصیل مذکورہ بالا سے ظاہر ہوا ہو گا کہ ہماری اس عبارت کا کہ "سیرت میں آج تک کوئی کتاب صحت کے التزام کے ساتھ نہیں لکھی گئی" اس کا کیا مطلب ہے اور کہاں تک صحیح ہے۔

اقوال کی تحقیق کی غرض سے آپؐ کے دیکھنے والوں اور ملنے والوں میں سے تقریباً تیرہ ہزار شخصوں کے نام اور حالات قلمبند کئے گئے، اور اس زمانہ میں کئے گئے جب تصنیف و تالیف کا آغاز تھا، طبقات ابن سعد، کتاب الصحابہ لابن السکن، کتاب لعبد اللہ بن علی ابن جارود، کتاب العقیلی فی الصحابۃ، کتاب ابن ابی حاتم الرازی، کتاب اللازرق، کتاب الدولابی، کتاب البغوی، (۱) طبقات ابن ماکولا، اسد الغابۃ، استیعاب، اصابہ فی احوال الصحابۃ صرف انہی بزرگوں کے حالات میں ہیں، کیا دنیا میں کسی شخص کے رفقاء میں سے اتنے لوگوں کے نام اور حالات درج تحریر ہوسکے ہیں۔

سیرۃ نبویؐ کے متعلق قدماء نے جو ذخیرہ (۲) مہیا کیا اس کی مختصر تاریخ اور کیفیت ہم اس غرض سے اس موقع پر درج کردیتے ہیں کہ ایک کامل اور مستند کتاب کے مرتب کرنے کے لئے اس ذخیرہ سے کیونکر کام لیا جاسکتا ہے، اور کہاں تک تحقیق و تنقید کی ضرورت ہے۔

فن سیرت کی ابتدا اور تحریری سرمایہ

عام طور پر یہ خیال ہے کہ چونکہ عرب میں لکھنے پڑھنے کا رواج نہ تھا، اور اسلام میں تدوین و تالیف کا آغاز خلیفہ منصور عباسی کے زمانہ سے (تقریباً ۱۴۲ھ میں) ہوا، اس لئے اس زمانہ تک سیرت اور روایات کا جو کچھ ذخیرہ تھا، زبانی تھا، تحریری نہ تھا، لیکن یہ خیال صحیح نہیں، عرب میں لکھنے پڑھنے کا رواج (گو کم سہی) مدت سے چلا آتا ہے، بہت قدیم زمانہ میں حمیری اور نابتی خط تھا، جس کے کتبے آج نہایت کثرت سے یورپ کی بدولت مہیا ہوگئے ہیں، اسلام سے کچھ پہلے وہ خط ایجاد ہوا جو عربی خط کہلاتا ہے، اور جس نے بہت سی صورتیں بدل کر آج یہ صورت اختیار کرلی ہے۔

اس خط کی تاریخ اور اس کی ابتدا کے متعلق جو قدیم روایتیں کتابوں میں مذکور ہیں، اکثر افسانہ ہیں، مثلاً ابن الندیم نے کلبی سے نقل کیا ہے کہ اول اول جن لوگوں نے عربی خط ایجاد کیا، ان کے یہ نام تھے، ابوجاد، ہواز، حطی، کلمون، سعفص، قریشیات (یہی نام ہیں جن کو ہم آج ابجد، ہوز، حطی، کلمن، سعفص، قرشت کہتے ہیں،) اسی طرح کعب کا یہ قول کہ تمام خطوط حضرت آدمؑ نے ایجاد کئے تھے، ابن الندیم نے حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کا یہ قول نقل کیا ہے، کہ سب سے پہلے جس نے عربی خط لکھا وہ تین شخص قبیلۂ بولان (قبیلۂ طے کی ایک شاخ) کے تھے، جو انبار میں آباد تھے، ان کے نام مرامر بن مرۃ، اسلم بن سدرہ، عامر بن جدرہ تھے۔

ان تمام روایتوں میں جو قرین قیاس ہے، وہ روایت ہے جو ابن الندیم نے عمر بن شبہ کی کتاب مکہ سے نقل کی ہے، یعنی سب سے پہلے عربی خط ایک شخص نے ایجاد کیا، جو بنو مخلد ابن نضر بن کنانہ کے خاندان سے تھا، اور غالباً یہ وہ زمانہ ہے جب قریش نے عروج حاصل کرلیا تھا، اور

---

(۱) ان کتابوں کا ذکر، استیعاب کے دیباچہ میں ہے۔ (۲) یہ ملحوظ رکھنا چاہئیے کہ حدیث کی کتابوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات اور اخلاق و عادات کے متعلق نہایت کثرت سے واقعات مذکور ہیں، جو سیرت میں کافی مدد دے سکتے ہیں، تاہم تنہا ان سے ایک تاریخی تصنیف تیار نہیں ہوسکتی، اس کے علاوہ ان میں تاریخی ترتیب نہیں ہے، یہاں ہم نے جن کتابوں کا ذکر کیا ہے حدیث کی کتابیں ان کے علاوہ ہیں۔

تجارت کے ذریعہ سے بیرونی ممالک میں آمد و رفت رکھتے تھے۔ ابن الندیم نے لکھا ہے کہ میں نے مامون الرشید کے کتب خانہ میں ایک دستاویز دیکھی تھی جو عبدالمطلب بن ہاشم (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جد امجد) کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھی، اس کے یہ الفاظ تھے۔

حق عبد المطلب بن هاشم من اهل مكة على فلان ابن فلا ن الحميري من اهل وزل صنعا عليه الف درهم فضة كيلا بالحديدة ومتى دعاه بها اجابه شهد الله والملكان (۱)

یہ عبدالمطلب بن ہاشم (جو مکہ کا بادشاہ ہے) کا قرضہ فلاں شخص پر ہے، جو صنعاء کا رہنے والا ہے، یہ چاندی کے ہزار درہم ہیں، جب طلب کیا جائے گا وہ ادا کرے گا خدا اور دو فرشتے اس کے گواہ ہیں۔

اس دستاویز سے ظاہر ہوتا ہے کہ عبدالمطلب نے کسی حمیری شخص کو ہزار درہم قرض دیئے تھے، خاتمہ میں دو فرشتوں کی گواہی لکھی ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں فرشتوں کا (اور شاید کرام کاتبین کا) اعتقاد موجود تھا۔

ابن الندیم نے لکھا ہے کہ اس دستاویز کا خط ایسا تھا جیسا عورتوں کا خط ہوتا ہے۔

علامہ بلاذری نے تصریح کی ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جب بعثت ہوئی تو قریش میں ۱۷ شخص لکھنا پڑھنا جانتے تھے، یعنی حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت ابو عبیدہؓ، طلحہؓ، یزیدؓ، ابو حذیفہؓ، ابو سفیانؓ، شفاؓ بنت عبداللہ (۲) وغیرہ۔

بدر کی لڑائی جو سنہ ۲ھ میں ہوئی، اس میں قریش کے جو لوگ گرفتار ہوئے، ان سے فدیہ لیا گیا، لیکن بعض ایسے بھی تھے، جو ناداری کی وجہ سے فدیہ نہیں ادا کر سکے، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان کو حکم دیا کہ ہر شخص دس دس بچوں کو اپنے ذمہ لے کر ان کو لکھنا سکھاوے چنانچہ حضرت زید بن ثابتؓ نے جو کاتب وحی ہیں اسی طرح لکھنا سیکھا تھا (۳)۔

ان واقعات سے معلوم ہو گا کہ عرب اور خصوصاً مکہ و مدینہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ ہی میں لکھنے پڑھنے کا کافی رواج ہو چکا تھا، البتہ یہ تحقیق طلب ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں روایتیں اور حدیثیں بھی قلمبند ہوئی تھیں یا نہیں، اور اس بنا پر سیرت کا کوئی تحریری سرمایہ بھی موجود تھا یا نہیں، بعض حدیثوں میں جن میں سے بعض صحیح مسلم میں مذکور ہیں، تصریح ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیثوں کے قلمبند کرنے سے منع فرمایا تھا، مسلم کے یہ الفاظ ہیں۔

لاتكتبوا عني ومن كتب عني غير القران ، فليمحه

مجھ سے جو سنو اس کو قلمبند نہ کرو (بجز قرآن کے) اور کسی نے قلم بند کیا ہو تو اس کو مٹا ڈالنا چاہیئے۔

(۱) ابن ندیم ص ۵، ۸ طبع مصر س۔ (۲) فتوح البلدان ذکر خط ص ۴۷۱ مطبوعہ یورپ (۳) طبقات ابن سعد غزوہ بدر ص ۱۴

آنحضرتؐ کے زمانہ کی تحریریں

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ ابتدائی زمانہ کا ارشاد ہے کیوں کہ متعدد صحیح حدیثوں سے ثابت ہے کہ آنحضرتؐ ہی کے زمانہ میں بعض صحابہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے آپؐ کے ارشادات قلم بند کر لیا کرتے تھے۔ صحیح بخاری (باب العلم) میں حضرت ابوہریرۃؓ کا قول ہے کہ "صحابہ میں مجھ سے زیادہ کسی کو حدیثیں محفوظ نہیں، البتہ عبداللہ بن عمرؓ مستثنیٰ ہیں، کیونکہ وہ آنحضرتؐ کی حدیثیں لکھ لیا کرتے تھے اور میں لکھتا نہ تھا"۔

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی عادت تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو سنتے تھے، لکھ لیا کرتے تھے۔ قریش نے ان کو منع کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کبھی غیظ کی حالت میں ہوتے ہیں، کبھی خوشی میں اور تم سب کچھ لکھتے جاتے ہو، عبداللہ بن عمرؓ نے اس بنا پر لکھنا چھوڑ دیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ واقعہ بیان کیا، آپ نے دہانِ مبارک کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ "تم لکھ لیا کرو اس سے جو کچھ نکلتا ہے حق نکلتا ہے" (۱)

خطیب بغدادی نے اپنے رسالہ تقیید العلم میں روایت کی ہے کہ اس بیاض کا نام جس میں عبداللہؓ آنحضرتؐ کی حدیثیں قلم بند کر لیا کرتے تھے، صادقہ تھا (۲)۔

ایک دفعہ آپ نے حکم دیا کہ جو لوگ اس وقت تک اسلام لا چکے ہیں، ان کے نام قلم بند کئے جائیں، چنانچہ پندرہ سو صحابہؓ کے نام دفتر میں درج کئے گئے (۳)۔

خطیب بغدادی نے تقیید العلم میں روایت کی ہے کہ "جب لوگ کثرت سے حضرت انسؓ کے پاس حدیثوں کے سننے کے لئے جمع ہو جاتے تھے تو وہ ایک مجنگ نکال لاتے تھے کہ "یہ وہ حدیثیں ہیں جو میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر لکھ لی تھیں"۔

متعدد قبائل کو آپؐ نے جو صدقات اور زکوٰۃ وغیرہ کے احکام بھیجے تھے وہ تحریری تھے اور کتب احادیث میں بعینہا منقول ہیں، اسی طرح سلاطین کو دعوتِ اسلام کے جو پیغام بھیجے گئے وہ بھی تحریری تھے۔

صحیح بخاری (باب کتابۃ العلم) میں ہے کہ فتح مکہ کے سال جب ایک خزاعی نے حرم میں ایک شخص کو قتل کیا کر دیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ناقہ پر سوار ہو کر خطبہ دیا، یمن کے ایک شخص نے آکر درخواست کی کہ یہ خطبہ مجھ کو تحریر کرا دیا جائے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ اس شخص کے لئے وہ خطبہ قلم بند کرا دیا جائے۔

غرض اس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک حسب ذیل تحریری سرمایہ مہیا ہو گیا تھا۔

(۱) جو حدیثیں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص یا حضرت علیؓ و حضرت انسؓ

(۱) ابوداؤد جلد ۲ ص ،، (۲) جامع بیان العلم للقاضی ابن عبدالبر مطبوعہ مصر ص ،، میں صادقہ کا ذکر ہے۔ (۳) صحیح بخاری باب الجہاد

دغیرہ نے قلم بند کیں (۱)۔

(۲) تحریری احکام اور معاہدات (حدیبیہ وغیرہ) اور فرامین جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبائل کے نام بھیجے (۲)۔

(۳) خطوط جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سلاطین (۳) اور امراء (۴) کے نام ارسال فرمائے۔

(۴) پندرہ سو (۱۵۰۰) صحابہؓ کے نام۔

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بعد اس تحریری ذخیرہ کو اس قدر ترقی ہوتی گئی کہ (بنو العباس سے پہلے) ولید بن یزید کے قتل کے بعد جب احادیث و روایت کا دفتر ولید کے کتب خانے سے منتقل ہوا تو صرف امام زہری کی مرویات اور تالیفات گھوڑوں اور گدھوں پر لاد کر لائی گئیں (۵)

مغازی

عرب میں علوم و فنون نہ تھے، صرف خاندانی معرکے اور لڑائیوں کے واقعات محفوظ رکھتے تھے، اس لحاظ سے قیاس یہ تھا کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے واقعات اور افعال و اقوال میں سب سے پہلے مغازی کی روایتیں پھیلتیں اور سب سے پہلے اسی فن کی بنیاد پڑتی۔ لیکن روایات کے تمام انواع میں مغازی کا درجہ سب سے متاخر رہا، خلفائے راشدینؓ اور اکابر صحابہؓ نے زیادہ تر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان اقوال و افعال پر توجہ کی، جن کو شریعت سے تعلق تھا اور جن سے فقہی احکام مستنبط ہوتے تھے۔

امام بخاری نے غزوہ احد کے ذکر میں سائب بن یزیدؓ سے یہ روایت نقل کی ہے۔

صحبت عبدالرحمن بن عوف وطلحة ابن عبیداللہ والمقداد و سعدا فما سمعت احدا منھم یحدث عن النبی صلی اللہ علیه وسلم الا انی سمعت طلحة یحدث عن یوم احد	میں عبدالرحمنؓ بن عوفؓ اور طلحہؓ بن عبیداللہ اور مقداد اور سعدؓ کی صحبت میں رہا، لیکن میں نے ان کو کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق حدیث بیان کرتے نہیں سنا، بجز اس کے کہ طلحہؓ غزوہ احد کا واقعہ بیان کرتے تھے۔

حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ اور طلحہؓ و مقدادؓ و سعدؓ وقاص، اکابر صحابہؓ میں ہیں اور ان سے بہت سی حدیثیں مروی ہیں، اس لئے اس عبارت کے یہی معنی ہو سکتے ہیں کہ یہ لوگ غزوات کے واقعات نہیں بیان کرتے تھے، بجز اس کے کہ طلحہؓ جنگ احد کے واقعات بیان کیا

(۱) بخاری جلد ۱ ص ۲۱ و ۲۲ صحیفہ علیؓ وکتابتہ لرجل من الیمن (۲) سنن ابن ماجہ ص ۱۳۰ و ابوداؤد جلد ۱ ص ۱۵۵-۱۵۶

(۳) بخاری جلد ۱ ص ۵ و ایضاً ص ۱۵ (۴) بخاری جلد ۱ ص ۱۵ (۵) تذکرۃ الحفاظ علامہ ذہبی تذکرہ امام زہری۔

کرتے تھے۔

یہی وجہ تھی کہ علماء میں جن لوگوں نے مغازی کو اپنا فن بنالیا تھا، وہ عوام میں جس قدر مقبول ہوتے تھے، خواص میں اس قدر مستند نہیں خیال کئے جاتے تھے، اس فن کے اساطین اور ارکان ابن اسحاق اور واقدی ہیں، واقدی کو تو محدثین علانیہ کذّاب کہتے ہیں، ابن اسحاق کو ایک گروہ ثقہ کہتا ہے لیکن اسی درجہ کا دوسرا گروہ ان کو بے اعتبار سمجھتا ہے، تفصیل آگے آئے گی۔

امام احمد بن حنبل کا قول ہے۔

ثلاثة كتب ليس لها اصول المغازى والملاحم والتفسير (۱)

تین قسم کی کتابیں ہیں جن کی کوئی اصل نہیں مغازی اور ملاحم اور تفسیر۔

خطیب بغدادی نے اس قول کو نقل کر کے لکھا ہے کہ امام ابن حنبل کی مراد ان خاص کتابوں سے ہوگی جو بے اصل ہیں، پھر لکھا ہے۔

اما كتب التفسير فمن اشهر ها كتابا الكلبى و مقاتل بن سليمان وقد قال احمد فى تفسير الكلبى من اوله الى آخره كذب

باقی تفسیر کی کتابیں تو ان میں سے کلبی اور مقاتل کی کتابیں بہت مشہور ہیں، امام احمد بن حنبل نے کہا ہے کہ کلبی کی تفسیر اول سے اخیر تک جھوٹ ہے۔

پھر لکھتے ہیں۔

واما المغازى فمن اشهر ها كتاب محمد بن اسحاق و كان يا خذ من اهل الكتاب وقد قال الشافعى كتب الواقدى كذب

باقی مغازی تو اس فن کی مشہور کتاب محمد ابن اسحاق کی کتاب ہے اور وہ عیسائیوں اور یہودیوں سے روایت کرتے تھے، اور امام شافعی نے کہا ہے کہ واقدی کی کتابیں جھوٹ ہیں۔

باوجود ان باتوں کے یہ ناممکن تھا کہ یہ حصہ نظر انداز کر دیا جاتا، اس لئے اکابر صحابہؓ اور محدثین نہایت احتیاط کے ساتھ جو واقعات جہاں تک خوب محفوظ ہوتے تھے، روایت کرتے تھے۔

تصنیف و تالیف کی ابتداء سلطنت کی وجہ سے ہوئی

صحابہ اور خلفائے راشدینؓ کے زمانہ میں اگرچہ فقہ و حدیث کی نہایت کثرت سے اشاعت ہوئی، بہت سے درس کے حلقے قائم ہوئے، لیکن جو کچھ تھا زیادہ تر زبانی تھا، لیکن بنو امیہ نے حکماً علماء سے تصنیفیں لکھوائیں، قاضی ابن عبدالبر نے جامع بیان العلم میں امام زہری کا قول نقل کیا ہے۔

كنا نكره كتاب العلم حتى اكرهنا عليه هؤلاء الا مراء (۲)

ہم لوگ علم کا قلمبند کرنا پسند نہیں کرتے تھے، یہاں تک کہ امراء نے ہم کو مجبور کیا۔

(۱) موضوعات ملا علی قاری مطبع مجتبائی ص ۸۵ (۲) مطبوعہ مصر ص ۱۳۶

سب سے پہلے امیر معاویہؓ نے عبید بن شریہ کو یمن سے بلاکر قدماء کی تاریخ مرتب کرائی جس کا نام اخبار الماضین ہے (۱)۔

امیر معاویہؓ کے بعد عبدالملک بن مروان نے، جو ۶۵ھ میں تخت نشین ہوا، ہر فن میں علماء سے تصنیفیں لکھوائیں۔ سعید بن جبیر جو اعلم العلما تھے، ان کو حکم بھیجا کہ قرآن مجید کی تفسیر لکھیں، چنانچہ امام موصوف نے تفسیر لکھ کر بھیجی جو کتب خانہ شاہی میں رکھی گئی۔ عطاء بن دینار کے نام سے جو تفسیر مشہور ہے، ان ہی کی تفسیر ہے۔ عطا کو خزانہ شاہی سے یہ نسخہ ہاتھ آگیا تھا (۲)۔

حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز کا زمانہ آیا تو انہوں نے تصنیف و تالیف کو زیادہ ترقی دی۔ تمام ممالک میں حکم بھیجا کہ احادیث نبویؐ مدون اور قلم بند کی جائیں۔ سعد بن ابراہیم جو بہت بڑے محدث اور مدینہ منورہ کے قاضی تھے، ان سے دفتر کے دفتر حدیثوں کے قلم بند کرائے اور تمام ممالک مقبوضہ میں بھیجے۔ علامہ ابن عبدالبر جامع بیان العلم میں لکھتے ہیں:۔

عن سعد بن ابراهيم قال امرنا عمر بن عبدالعزيز بجمع السنن فكتبناها دفترا دفترا فبعث الى كل ارض له عليها سلطان دفترا (۳)	سعد بن ابراہیم کہتے ہیں کہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے ہم کو احادیث کے جمع کرنے کا حکم دیا، ہم نے دفتر کے دفتر لکھے۔ عمرؒ نے جہاں جہاں ان کی حکومت تھی ایک ایک دفتر بھیج دیا۔

ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم انصاری جو اس زمانے کے بہت بڑے محدث اور امام زہری کے استاد اور مدینہ کے قاضی تھے، ان کو بھی خاص طور پر احادیث کے جمع کرنے کا حکم بھیجا (۴)

حضرت عائشہؓ کی روایتیں حدیث میں حضرت عائشہؓ کی مرویات کی ایک خاص حیثیت ہے، یعنی ان سے اکثر وہ حدیثیں مروی ہیں، جو عقائد یا فقہ کے مہمات مسائل ہیں، اس لئے عمرؒ بن عبدالعزیز نے ان کی روایتوں کے ساتھ زیادہ اعتنا کیا۔ عمرۃ بنت عبدالرحمنؒ ایک خاتون تھیں، ان کو حضرت عائشہؓ نے خاص اپنے آغوش تربیت میں پالا تھا، وہ بڑی محدثہ اور عالمہ تھیں، تمام علماء کا اتفاق ہے کہ حضرت عائشہؓ کی مرویات کا ان سے بڑھ کر کوئی عالم نہ تھا، عمرؒ بن عبدالعزیز نے ابوبکر بن محمد کو خط لکھا کہ عمرۃ کے مسائل اور روایات قلم بند کر کے بھیج دیں۔ (۵)

مغازی پر خاص توجہ اب تک مغازی و سیر کے ساتھ اعتنا نہیں کیا گیا تھا۔ حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز نے اس فن کی طرف خاص توجہ کی اور حکم دیا کہ غزوات نبویؐ کا خاص حلقہ درس قائم کیا جائے۔ عاصم بن عمر بن قتادہ انصاری المتوفی ۱۲۱ھ اس فن میں خاص کمال رکھتے تھے ان کو حکم دیا کہ جامع مسجد دمشق میں بیٹھ کر لوگوں کو مغازی اور مناقب کا درس دیں (۶)

---

(۱) فہرست ابن الندیم ص ۲۴۴ (۲) میزان الاعتدال ترجمہ عطاء بن دینار (۳) مطبوعہ مصر ص ۳۶ (۴) طبقات ابن سعد جزء ثانی قسم ثانی ص ۱۳۴ (۵) تہذیب التہذیب ترجمہ ابوبکر بن محمد و عمرۃ بنت عبدالرحمن و طبقات ابن سعد جزء دوم حصہ دوم ص ۱۳۴ (۶) تہذیب التہذیب ترجمہ عاصم بن عمر بن قتادہ

امام زہری اور فن سیرت

اسی زمانہ میں امام زہری نے مغازی پر ایک مستقل کتاب لکھی، اور جیسا کہ امام سہیلی نے روض الالف میں تصریح کی ہے، یہ اس فن کی پہلی تصنیف تھی، امام زہری اس زمانہ کے اعلم العلماء تھے، فقہ اور حدیث میں ان کا کوئی ہمسر نہ تھا امام بخاری کے شیخ الشیوخ ہیں، انہوں نے حدیث و روایات کے حاصل کرنے میں یہ محنتیں اٹھائیں کہ مدینہ منورہ میں ایک ایک انصاری کے گھر پر جاتے، جوان بڈھے، عورت، مرد، جو مل جاتا، یہاں تک کہ پردہ نشین (۱) عورتوں سے جاکر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اقوال و حالات پوچھتے، اور قلمبند کرتے، وہ نسباً قریشی تھے، سنہ ۵۰ھ میں پیدا ہوئے، بہت سے صحابہؓ کو دیکھا تھا، سنہ ۸۰ھ میں عبدالملک بن مروان کے دربار میں گئے، اس نے بہت قدر و منزلت کی۔ کتاب المغازی غالباً حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی ہدایت کے موافق لکھی، یہ بات خاص طور پر لحاظ کے قابل ہے کہ امام موصوف سلاطین کے دربار سے تعلق رکھتے تھے، اور مقربین خاص میں داخل تھے، ہشام بن عبدالملک نے اپنے بچوں کی تعلیم ان کے سپرد کی تھی، سنہ ۱۲۴ھ میں وفات پائی۔

امام زہری کے تلامذہ

امام زہری کی وجہ سے مغازی و سیرت کا عام مذاق پیدا ہو گیا، ان کے حلقۂ درس سے اکثر ایسے لوگ نکلے جو خاص اس فن میں کمال رکھتے تھے، ان میں سے یعقوب بن ابراہیم، محمد بن صالح تمار، عبدالرحمن بن عبدالعزیز، فن مغازی میں خاص شہرت رکھتے تھے، چنانچہ تہذیب التہذیب وغیرہ میں ان لوگوں کا امتیازی وصف صاحب مغازی لکھا جاتا ہے۔

موسیٰ بن عقبہ اور سیرت

زہری کے تلامذہ میں سے دو شخصوں نے اس فن میں نہایت شہرت حاصل کی، اور یہی دو شخص ہیں جن پر اس فن کا سلسلہ ختم ہوتا ہے، موسیٰ بن عقبہ اور محمد بن اسحاق، موسیٰ بن عقبہ خاندان زبیرؓ کے غلام تھے، عبداللہ بن عمرؓ کو دیکھا تھا، فن حدیث میں امام مالک ان کے شاگرد ہیں، امام مالک ان کے نہایت مداح تھے، اور لوگوں کو ترغیب دیتے تھے، کہ فن مغازی سیکھنا ہو تو موسیٰ سے سیکھو، ان کے مغازی کے جو خصوصیات ہیں، یہ ہیں۔

(۱) مصنفین اب تک روایات میں صحت کا التزام نہیں کرتے تھے، انہوں نے زیادہ تر اس کا التزام کیا۔

(۲) عام مصنفین کا یہ مذاق تھا کہ کثرت سے واقعات نقل کئے جائیں، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ ہر قسم کی رطب و یابس روایتیں آجاتی تھیں، موسیٰ نے احتیاط کی اور صرف وہی روایتیں لیں، جو ان کے نزدیک صحیح ثابت ہوئیں، یہی وجہ ہے کہ ان کی کتاب بہ نسبت اور کتبِ مغازی کے مختصر ہے۔

(۳) چونکہ روایتِ حدیث کے لئے کسی عمر کی قید نہ تھی، اس لئے اکثر لوگ بچپن اور آغاز شباب ہی سے حلقۂ درس میں شامل ہو جاتے تھے، اور حدیثیں سن کر لوگوں سے روایت کرتے تھے۔

(۱) تہذیب التہذیب ترجمہ امام زہری (محمد بن مسلم)

لیکن چونکہ اس عمر تک واقعات کا صحیح طور سے سمجھنا اور محفوظ رکھنا ممکن نہ تھا، اس لئے اکثر روایتوں میں تغیر اور اختلاط ہو جاتا تھا، موسیٰ نے بخلاف اور لوگوں کے کبر سن میں اس فن کو سیکھا تھا۔ (۱) سنہ ۱۴۱ھ میں وفات پائی۔

موسیٰ کی کتاب آج موجود نہیں، لیکن ایک مدت تک شائع و ذائع رہی، اور سیرت کی تمام قدیم کتابوں میں کثرت سے اس کے حوالے آتے ہیں۔

محمد بن اسحاق اور سیرت

محمد بن اسحاق نے فن مغازی میں سب سے زیادہ شہرت حاصل کی، وہ امام فن مغازی کے نام سے مشہور ہیں، شہرت عام میں اگرچہ واقدی، ان سے کم نہیں لیکن واقدی کی لغو بیانی مسلمہ عام ہے، اور اس لئے ان کی شہرت بدنامی کی شہرت ہے، محمد بن اسحاق تابعی ہیں، ایک صحابی (حضرت انسؓ) کو دیکھا تھا، علم حدیث میں کمال تھا، امام زہری کے دروازہ پر دربان مقرر تھا کہ کوئی شخص بغیر اطلاع کے نہ آئے، لیکن محمد بن اسحاق کو عام اجازت تھی کہ جب چاہیں چلے آئیں، ان کے ثقہ اور غیر ثقہ ہونے کی نسبت محدثین میں اختلاف ہے، امام مالک ان کے سخت مخالف ہیں لیکن محدثین کا عام فیصلہ یہ ہے کہ مغازی اور سیرَ میں ان کی روایتیں استناد کے قابل ہیں، امام بخاری نے صحیح بخاری میں ان کی روایت نہیں لی، لیکن جزء القراءۃ میں ان سے روایت کی ہے تاریخ میں تو اکثر واقعات انہی سے لیتے ہیں۔

فن مغازی کو انہوں نے اس قدر ترقی دی، اور اس قدر دلچسپ بنا دیا کہ خلفائے عباسیہ جو زیادہ تر اور قسم کی تصنیفات کا مذاق رکھتے تھے، ان میں مغازی کا مذاق پیدا ہو گیا، چنانچہ ابن عدی نے اس احسان کا خاص طرح پر ذکر کیا ہے، ابن عدی نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس فن میں کوئی تصنیف ان کی تصنیف کے رتبہ کو نہیں پہنچی (۲)۔

ابن حبان نے کتاب الثقات میں لکھا ہے کہ محدثین کو محمد بن اسحاق کی کتاب پر اعتراض تھا تو یہ تھا کہ خیبر وغیرہ کے واقعات وہ ان یہودیوں سے دریافت کر کے داخل کتاب کرتے تھے، جو مسلمان ہو گئے تھے، اور چونکہ یہ واقعات انہوں نے یہودیوں سے سنے ہوں گے، اس لئے ان پر پورا اعتماد نہیں ہو سکتا، علامہ ذہبی کی تصریح سے ثابت ہوتا ہے کہ محمد بن اسحاق یہود و نصاریٰ سے روایت کرتے تھے، اور ان کو ثقہ سمجھتے تھے، سنہ ۱۵۱ھ میں وفات پائی۔

محمد بن اسحاق کی کتاب المغازی کا ترجمہ شیخ سعدی کے زمانہ میں ابو بکر سعد زنگی کے حکم سے فارسی میں ہوا، اس کا قلمی نسخہ الہ آباد میں ہماری نظر سے گذرا ہے۔

محمد بن اسحاق کی کتاب کثرت سے پھیلی، اور بڑے بڑے مشہور محدثوں نے اس کے نسخے مرتب کئے، اسی کتاب کو ابن ہشام نے زیادہ منقح اور اضافہ کر کے مرتب کیا، جو سیرت ابن ہشام کے نام سے مشہور ہے چونکہ اصل کتاب آج کم ملتی ہے اس لئے آج اس کی جو یادگار

---

(۱) تہذیب التہذیب ترجمہ موسیٰ بن عقبہ (۲) تہذیب التہذیب۔

موجود ہے، وہ یہی ابن ہشام کی کتاب ہے۔

ابن ہشام اور سیرت

ابن ہشام کا نام عبد الملک ہے، وہ نہایت ثقہ اور نامور محدث اور مورخ تھے۔ حمیر کے قبیلہ سے تھے، اور غالباً اسی تعلق سے سلاطین حمیر کی تاریخ لکھی جو آج بھی موجود ہے، انہوں نے سیرت میں یہ اضافہ کیا کہ سیرت میں جو مشکل الفاظ آتے ہیں، ان کی تفسیر بھی لکھی، سنہ ۲۱۳ یا ۲۱۸ھ میں وفات پائی۔

سیرت ابن ہشام کی مقبولیت کی بنا پر لوگوں نے اس کو نظم کیا، چنانچہ ابونصر فتح بن موسیٰ خضراوی المتوفی سنہ ۶۶۳ھ و عبدالعزیز بن احمد المعروف بہ سعدیری المتوفی فی حدود سنہ ۶۰۷ھ و ابو اسحاق انصاری تلمسانی و فتح الدین محمد بن ابراہیم معروف بہ ابن الشہید المتوفی سنہ ۹۳، ہجری نے منظوم کیا، اخیر کتاب میں قریباً دس ہزار شعر ہیں، اور اس کا نام فتح الغریب فی سیرۃ الحبیب ہے۔

ابن سعد اور سیرت

واقدی خود تو قابل ذکر نہیں لیکن ان کے تلامذۂ خاص میں سے ابن سعد نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) اور صحابہؓ کے حالات میں ایسی جامع اور مفصل کتاب لکھی کہ آج تک اس کا جواب نہ ہو سکا۔

ابن سعد مشہور محدث ہیں، محدثین نے عموماً لکھا ہے کہ گو ان کے استاد (واقدی) قابل اعتبار نہیں لیکن وہ خود قابلِ سند ہیں، خطیب بغدادی نے ان کی نسبت یہ الفاظ لکھے ہیں:-

کان من اھل العلم و الفضل و الفھم و العدالۃ صنّف کتاباً کبیرًا فی طبقات الصحابۃ و التابعین الی وقتہ فاجادفیہ و احسن (۱)

یہ موالیٔ بنی ہاشم سے تھے، بصرہ میں پیدا ہوئے لیکن بغداد میں سکونت اختیار کر لی تھی، بلاذری جو مشہور مورخ ہیں، انہی کے شاگرد ہیں، سنہ ۲۳۰ھ میں ۶۲ برس کی عمر میں وفات پائی۔

ان کی کتاب کا نام طبقات ہے، ۱۲ جلدوں میں ہے، دو جلدیں خاص آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حالات میں ہیں، اور یہ حصہ دراصل سیرۃ نبوی ہے، باقی جلدیں صحابہؓ (و تابعین) کے حالات میں ہیں اور چونکہ صحابہؓ کے حالات میں ہر جگہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ذکر آتا ہے، اس لئے ان حصوں میں بھی سیرت کا بڑا سرمایہ موجود ہے۔

یہ کتاب تقریباً ناپید ہو چکی تھی، یعنی دنیا کے کسی کتب خانہ میں اس کا پورا نسخہ موجود نہ تھا، شہنشاہ جرمن کو اس کی طبع و اشاعت کا خیال ہوا، چنانچہ لاکھ روپے جیب خاص سے دیئے اور پروفیسر ساخو کو اس کام پر مامور کیا کہ ہر جگہ سے اس کے اجزاء فراہم کر کے لائیں، پروفیسر موصوف نے قسطنطنیہ، مصر اور یورپ جا کر جا بجا سے تمام جلدیں بہم پہنچائیں، یورپ کے بارہ پروفیسروں نے الگ الگ جلدوں کی تصحیح اپنے ذمہ لی، چنانچہ نہایت اہتمام اور صحت کے ساتھ یہ نسخہ لیڈن (ہالینڈ)

---

(۱) تہذیب التہذیب ترجمہ محمد بن سعد۔

میں چھپ کر شائع ہوا۔

اس کتاب کا بڑا حصہ واقدی سے ماخوذ ہے لیکن چونکہ تمام روایتیں بہ سند مذکور ہیں، اس لئے واقدی کی روایتیں بہ آسانی الگ کرلی جاسکتی ہیں۔

اس زمانہ میں سیرت پر اور بھی بہت سی کتابیں لکھی گئیں چنانچہ کشف الظنون وغیرہ میں ان کے نام مذکور ہیں، لیکن چونکہ نام کے سوا ان کے متعلق اور کچھ معلوم نہیں نہ ان کا آج وجود ہے، اس لئے ہم ان کے نام نظر انداز کرتے ہیں۔

امام بخاری اور سیرت

سیرت کے سلسلہ سے الگ تاریخی تصنیفات ہیں، ان میں سے جو محدثانہ طریقہ پر لکھی گئیں، یعنی جن میں روایتیں بہ سند مذکور ہیں ان میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حالات اور واقعات کا جو حصہ ہے، وہ بھی دراصل سیرت نبویؐ ہے، ان میں سب سے مقدم اور قابل استناد امام بخاری کی دونوں تاریخیں ہیں، لیکن دونوں نہایت مختصر ہیں، تاریخ صغیر چھپ گئی ہے، اس میں سیرت نبویؐ کا حصہ کتاب کا دسواں حصہ بھی نہیں، یعنی صرف ۱۵ صفحے ہیں، اور ان میں بھی کوئی ترتیب نہیں کبیر البتہ بڑی ہے میں نے اس کا نسخہ جامع ایا صوفیہ میں دیکھا تھا، لیکن سوانح نبوی اس میں بہت کم ہیں، اور جستہ جستہ واقعات بلا ترتیب مذکور ہیں۔

امام طبری اور سیرت

تاریخی سلسلہ میں سب سے جامع اور مفصل کتاب امام طبری کی تاریخ کبیر ہے، طبری اس درجہ کے شخص ہیں کہ تمام محدثین ان کے فضل و کمال، وثوق اور وسعت علم کے معترف ہیں، ان کی تفسیر احسن التفاسیر خیال کی جاتی ہے، محدث ابن خزیمہ کا قول ہے کہ دنیا میں، میں کسی کو ان سے بڑھ کر عالم نہیں جانتا، سنہ ۳۱۰ھ میں وفات پائی۔

بعض محدثین (سلیمانی) نے ان کی نسبت لکھا ہے کہ یہ شیعوں کے لئے حدیثیں وضع کیا کرتے تھے، لیکن علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں لکھا ہے:۔

ھذا رجم بالظن الکاذب بل ابن جریر من کبار ائمۃ الاسلام المعتمدین	یہ جھوٹی بدگمانی ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ابن جریر اسلام کے معتمد اماموں میں سے ایک بڑے امام ہیں۔

علامہ ذہبی نے اسی موقع پر لکھا ہے کہ "ان میں فی الجملہ تشیع تھا، لیکن مضر نہیں" تمام مستند اور مفصل تاریخیں، مثلاً تاریخ کامل ابن الاثیر، ابن خلدون، ابوالفداء وغیرہ ان ہی کی کتاب سے ماخوذ اور اسی کتاب کے مختصرات ہیں، یہ کتاب بھی ناپید تھی اور یورپ کی بدولت شائع ہوئی

فہرست متقدمین علمائے سیرت

جو لوگ خاص فن سیرت کے ارکان اور معتمد ہیں، ان کا اور ان کی تصنیفات کا ایک مختصر نقشہ ہم اس مقام پر درج کرتے ہیں (۱)۔

(۱) حاشیہ کے لیے ص ۱۸ دیکھئے۔

نام مصنف	سنہ وفات	حالات
عروہ بن زبیر	سنہ ۹۴ھ	حضرت زبیرؓ کے بیٹے اور حضرت ابو بکر صدیقؓ کے نواسے تھے، حضرت عائشہؓ کے آغوش تربیت میں پلے تھے، سیرت و مغازی میں کثرت سے ان کی روایتیں ہیں، ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کے متعلق لکھا ہے، کان عالما بالسیرۃ. صاحب کشف الظنون نے مغازی کے بیان میں لکھا ہے کہ بعضوں کی رائے ہے کہ فن مغازی کی سب سے پہلی کتاب ان ہی نے تدوین کی۔
شعبی	سنہ ۱۰۹ھ	مشہور محدث ہیں، اکثر فنون میں کمال رکھتے تھے، خلافت دمشق کی طرف سے سفیر بن کر قسطنطنیہ گئے تھے، فن مغازی و سیر میں ان کو اس درجہ واقفیت تھی کہ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ فرماتے تھے کہ "گو میں ان غزوات میں بذات خود شریک تھا، مگر یہ مجھ سے زیادہ ان حالات کو جانتے ہیں"۔
وہب بن منبہ	سنہ ۱۱۴ھ	یمن کے عجمی خاندان سے تھے، حضرت ابو ہریرہؓ سے کچھ حدیثیں سنی تھیں، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق کتب عہد قدیم کی بشارت اور پیشین گوئیاں کثرت سے انہی سے مروی ہیں۔
عاصم بن عمر بن قتادہ انصاری	سنہ ۱۲۱ھ	مشہور تابعی ہیں، حضرت انسؓ اور اپنے باپ اور اپنی دادی رمیثہ سے روایت کرتے ہیں، مغازی اور سیر میں نہایت وسیع المعلومات تھے، خلیفہ عمر بن عبد العزیزؒ کے حکم سے مسجد دمشق میں بیٹھ کر اس فن کی تعلیم دیتے تھے۔
محمد بن مسلم بن شہاب زہری	سنہ ۱۲۴ھ	ان کا ذکر اوپر گذر چکا ہے۔
یعقوب بن عتبہ بن مغیرہ بن الاخنس بن شریق الثقفی	سنہ ۱۲۸ھ	نہایت ثقہ تھے، عمال اور گورنر انتظام ملکی میں ان سے مدد لیتے تھے، فقہائے مدینہ میں ان کا شمار تھا، سیرت نبویؐ کے عالم تھے، ان کا دادا اخنس بن شریق وہی شخص ہے، جو رسول اللہ

(بقیہ حاشیہ ص ۱۷) ان مصنفین کی تصنیفات اکثر ناپید ہیں (یہ فہرست تہذیب التہذیب وغیرہ سے مرتب کی گئی ہے۔) ان کے نام لکھنے سے یہ غرض ہے کہ آج جو تصنیفیں ملتی ہیں ان میں اکثر ان کے حوالے آئے ہیں اس لئے ناظرین کو ان حوالوں کی صحت و عدم صحت یا قوت و ضعف کے فیصلہ کرنے کا کچھ موقع حاصل ہوگا۔

		صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا دشمن تھا۔
موسیٰ بن عقبۃ الاسدی	سنہ ۱۴۱ھ	ان کا ذکر اوپر گذر چکا ہے۔
ہشام بن عروہ ابن زبیر	سنہ ۱۴۶ھ	زیادہ تر اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں، زہری کے بھی شاگرد ہیں، علمائے مدینہ میں ان کا شمار ہے، بغداد میں جو روایتیں انھوں نے لیں، محدثین کا بیان ہے، کہ ان میں تساہل سے کام لیا ہے، سیرت کے ذخیرۂ روایات میں ان کا بہت بڑا حصہ شامل ہے، جن کو وہ اپنے باپ کے واسطہ سے حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں، فن سیرت میں ان کے متعدد نامور تلامذہ ہیں۔
محمد بن اسحاق بن یسار المطلبی	سنہ ۱۵۱ھ	ان کا ذکر اوپر گذر چکا ہے۔
عمر بن راشد الازدی	سنہ ۱۵۲ھ	امام زہری کے تلامذہ میں امام مالک کے بعد ان کا دوسرا درجہ ہے، اساطینِ علمِ حدیث میں تھے، مغازی میں ایک کتاب ان کی تصنیف ہے جس کا نام ابن ندیم نے کتاب المغازی لکھا ہے۔
عبدالرحمن بن عبدالعزیز اللاوسی	سنہ ۱۶۲ھ	زہری کے شاگرد تھے، مسلم نے ان سے ایک روایت کی ہے، محدثین کے نزدیک ضعیف الروایت ہیں، فن سیرت کے عالم تھے، ابن سعد نے ان کے متعلق لکھا ہے، کان عالما بالسیرۃ
محمد بن صالح بن دینار التمار	سنہ ۱۶۸ھ	زہری کے شاگرد اور واقدی کے استاذ ہیں، ابن سعد کا بیان ہے کہ وہ سیرت و مغازی کے عالم تھے، اکثر محدثین نے ان کی توثیق کی ہے، ابوالزناد جو بڑے پایہ کے محدث ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اگر صحیح مغازی سیکھنا ہو تو محمد بن صالح سے سیکھو۔
ابو معشر نجیح المدنی	سنہ ۱۷۰ھ	ہشام بن عروہ کے شاگرد تھے، ثوری اور واقدی نے ان سے روایت کی ہے، گو محدثین نے روایت حدیث میں تضعیف کی ہے، لیکن سیرت و مغازی میں ان کی جلالت شان کا اعتراف کیا ہے، امام ابن حنبل کہتے ہیں کہ وہ اس فنّ میں صاحب نظر ہیں، ابن ندیم نے ان کی کتاب المغازی کا ذکر کیا ہے، کتبِ سیرت میں ان کا نام کثرت سے آتا ہے۔

عبداللہ بن جعفر ابن عبدالرحمن المخزومی	سنہ ۱۷۰ھ	مشہور صحابی مسور بن مخرمہؓ کے پڑپوتے تھے۔ فن حدیث میں خاص پایہ رکھتے تھے۔ سیرت نبویؐ کے اکابر علماء میں تھے۔ ابن سعد نے ان کی شان میں یہ الفاظ لکھے ہیں "من رجال اهل المدينة عالما بالمغازی"۔
عبدالملک بن محمد بن ابی بکر بن عمر بن حزم الانصاری	سنہ ۱۷۶ھ	فن حدیث و سیر میں ان کا خاندان ہمیشہ نامور رہا۔ ان کے دادا وہ شخص ہیں، جنہوں نے خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ کے حکم سے سب سے پہلے فن حدیث کی تدوین کی، ان کے رشتہ کی دادی عمرہؓ حضرت عائشہؓ کی تربیت یافتہ تھیں۔ یہ خود سیر و مغازی کے عالم تھے، اپنے باپ اور چچا سے تعلیم پائی تھی۔ خلیفہ ہارون الرشید نے ان کو قاضی مقرر کیا تھا، لوگ ان سے مغازی سیکھتے تھے، اس فن میں ان کی ایک تصنیف کتاب المغازی بھی ہے۔
علی بن مجاہد الرازی الکندی	بعد سنہ ۱۸۰ھ	ابو معشر نجیح کے تلامذہ میں تھے، امام ابن حنبل نے ان سے روایت کی ہے، مغازی کے جامع اور مصنف ہیں، لیکن ارباب نقد کے نزدیک ان کی تصنیف اعتبار کے قابل نہیں۔
زیاد بن عبداللہ بن الطفیل البکائی	سنہ ۱۸۳ھ	ابن اسحاق کے شاگرد اور ابن ہشام کے استاد تھے، ان دونوں بزرگواروں کے واسطۃ العقد یہی ہیں، سیرت کے عشق میں گھربار بیچ کر استاد کے ساتھ نکل کھڑے ہوئے تھے، اور مدت تک سفر و حضر میں ان کے شریک رہے۔ محدثین کی بارگاہ میں گو ان کا اعزاز کم ہے لیکن کتاب السیرۃ کے سب سے معتبر راوی یہی سمجھے جاتے ہیں۔
سلمہ بن الفضل الابرش الانصاری	سنہ ۱۹۱ھ	ابن اسحاق کے شاگرد اور ان کی سیرت کے راوی ہیں الرے کے قاضی تھے، اہل نقد کے نزدیک قابل احتجاج نہیں لیکن ابن معین جو اسمائے رجال کے بڑے ماہر ہیں، مغازی میں ان کی توثیق کرتے ہیں اور ان کی سیرت کو بہترین سیر تہائے نبویؐ کہتے ہیں، طبری میں انکے واسطہ سے اکثر روایتیں مروی ہیں۔

ابو محمد یحییٰ بن سعید ابن ابان الاموی	سنہ ۱۹۴ھ	ہشام بن عروہ اور ابن جریج سے تلمذ تھا، ابن سعد نے لکھا ہے کہ گو قلیل الروایت ہیں، لیکن ثقہ ہیں، صاحب کشف الظنون نے مصنفینِ مغازی میں ان کا نام بھی لیا ہے۔
ولید بن مسلم القرشی	سنہ ۱۹۵ھ	شام کے مشہور محدث اور نہایت قوی الحافظہ تھے، شام میں ان کے زمانہ میں ان سے بڑا کوئی عالم نہ تھا، تاریخ و مغازی میں وکیع سے ان کا درجہ بڑا سمجھا جاتا تھا، ان کی تصنیفات کی تعداد ستر، ہے، جن میں ایک کتاب المغازی ہے، کتاب الفہرست میں اس کا ذکر موجود ہے۔
یونس بن بکیر	سنہ ۱۹۹ھ	ہشام بن عروہ اور ابن اسحاق کے شاگرد ہیں، فن روایت وحدیث میں ان کا متوسط درجہ ہے، اکثر محدثین نے ان کی توثیق کی ہے، علامہ ذہبی نے تذکرہ میں ان کا نام بہ لقب صاحب المغازی لیا ہے انہوں نے مغازی ابن اسحاق کا ذیل لکھا ہے (زرقانی مواہب جلد ۳ ص ۱۰)۔
محمد بن عمر الواقدی الاسلمی	سنہ ۲۰۷ھ	سیرت نبویؐ کے متعلق ان کی دو کتابیں ہیں، کتاب السیرۃ اور کتاب التاریخ والمغازی والمبعث، امام شافعی فرماتے ہیں، کہ واقدی کی تمام تصانیف جھوٹ کا انبار ہے، کتب سیرت کی اکثر بیہودہ روایتوں کا سرچشمہ ان ہی کی تصانیف ہیں، ایک ظریف محدث نے خوب کہا ہے، کہ "اگر واقدی سچا ہے تو دنیا میں کوئی اسکا ثانی نہیں اور اگر جھوٹا ہے، تب بھی دنیا میں اس کا جواب نہیں"
یعقوب بن ابراہیم الزہری	سنہ ۲۰۸ھ	حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ کی اولاد میں تھے، زہری اور ان کے تلامذہ کے شاگرد ہیں، مغازی میں ان کا یہ رتبہ تھا، کہ ابن معین جیسا ناقدِ رجال ان سے اس فن کی تحصیل کرتا تھا۔
عبدالرزاق بن ہمام بن نافع الحمیری	سنہ ۲۱۱ھ	ثقات محدثین میں ان کا شمار ہے، مزاج میں کسی قدر تشیع تھا، ابن معین کہتے ہیں کہ اگر عبدالرزاق مرتد بھی ہو جائیں، تب بھی ہم ان سے روایت حدیث ترک نہیں کرسکتے، آخر عمر میں بصارت جاتی رہی تھی، اس

		لئے اس زمانہ کی حدیثیں ناقابلِ سند ہیں، فن مغازی میں ان کی ایک تالیف ہے۔
عبدالملک بن ہشام الحمیری	سنہ ۲۱۳ یا ۲۱۸ھ	ان کا ذکر گذر چکا ہے۔
علی بن محمد المدائنی	سنہ ۲۲۵ھ	ابو معشر نجیح اور سلمۃ بن الفضل وغیرہ کے شاگرد تھے، تاریخ وانساب عرب میں نہایت وسیع المعلومات تھے، محدثین میں ان کا شمار نہیں، لیکن مورخین کے امام ہیں اغانی کے دفتر بے پایاں کا مخزن یہی ہیں، تاریخ و انساب میں ان کی کثرت سے تصنیفات ہیں، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حالات میں ان کی کتاب نہایت مبسوط ہے، اور ابن الندیم کے بیان کے مطابق ہر قسم کے متعدد اور متنوع عنوان قائم کئے ہیں۔
عمر بن شبۃ البصری	سنہ ۲۶۲ھ	حدیث، تاریخ، ادب، لغت، شاعری اور نحو کے امام ہیں، مکہ مبارکہ، مدینہ طیبہ، اور بصرہ کی تاریخیں لکھی ہیں، علم سیر میں نہایت بلند پایہ تھے، حدیث میں ابن ماجہ اور تاریخ میں بلاذری، اور ابو نعیم ان کے شاگرد تھے۔
محمد بن عیسیٰ ترمذی	سنہ ۲۷۹ھ	مشہور محدث ہیں جن کی کتاب صحاح ستہ میں تیسرا درجہ رکھتی ہے، سیرت نبوی میں ان کا خاص رسالہ ہے جس کا موضوع گذشتہ تصانیف سے الگ ہے، اس رسالہ کا نام کتاب الشمائل ہے، جس میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ذاتی حالات و عادات و اخلاق کا ذکر ہے، اس بات کا التزام کیا ہے، کہ تمام روایتیں معتبر اور صحیح ہوں، اس رسالہ پر متعدد علماء نے شروح و حواشی لکھے۔
ابراہیم بن اسحاق بن ابراہیم	سنہ ۲۸۵ھ	محدثین کبار میں شمار ہے، مسند صحابہؓ ان کی تالیف ہے جس کے آخر میں کتاب المغازی شامل ہے۔
ابو بکر احمد بن ابی خیثمۃ البغدادی	سنہ ۲۹۹ھ	حدیث میں ابن حنبل اور ابن معین کے شاگرد، اور تاریخ و سیر کے جلیل القدر عالم تھے، تاریخ کبیر ان کی تصنیف ہے، جس میں سیرت نبوی کا حصہ بھی شامل ہے۔

محمد بن عائذ دمشقی	ان کی مغازی معتبر خیال کی جاتی ہے حافظ ابن حجر وغیرہ اکثر اس کے حوالے دیتے ہیں۔
فہرست متاخرین علمائے سیرت	یہ قدماء کی تصنیفات تھیں، مابعد کی تصنیفات کا ہم ایک مختصر نقشہ ذیل میں درج کرتے ہیں، یہ تصنیفات قدیم تصنیفات اور احادیث کی کتابوں

سے ماخوذ ہیں، اس نقشہ میں ان کتابوں کا ذکر بھی ہے، جو قدماء کی تصنیفات کے متعلق شرح کے طور پر لکھی گئی ہیں، ان کا ذکر اس وجہ سے کیا گیا ہے کہ یہ فی نفسہ مستقل تصنیفات ہیں، اور ان میں جس قدر ذخیرۂ معلومات ہے خود اصل کتابوں میں نہیں۔

روض الانف: سیرت ابن اسحاق کی شرح ہے، مصنف کا نام عبدالرحمن سہیلی ہے جنہوں نے سنہ ۵۸۱ھ میں وفات پائی، یہ اکابر محدثین میں سے ہیں، اور تمام مصنفینِ مابعد سیرتِ نبویؐ کی تحقیقات اور معلومات کے متعلق اُن کے خوشہ چین ہیں، مصنف نے دیباچہ میں لکھا ہے، کہ میں نے یہ کتاب ۱۲۰ کتابوں کی مدد سے لکھی، اس کا قلمی نسخہ ہمارے استعمال میں ہے۔

سیرت دمیاطی: حافظ عبدالمومن دمیاطی المتوفی سنہ ۷۰۵ھ کی تصنیف ہے، اکثر کتابوں میں اس کے حوالے آتے ہیں، اس کتاب کا نام المختصر فی سیرۃ سیّدالبشر، ہے قریباً سو ۱۰۰ صفحوں میں ہے، پٹنہ کے کتب خانہ میں اس کا ایک نسخہ موجود ہے۔

سیرتِ خلاطی:۔ علاء الدین علی بن محمد خلاطی حنفی کی تصنیف ہے، سنہ ۷۰۸ھ میں وفات پائی۔

سیرت گازرونی:۔ شیخ ظہیرالدین علی بن محمد گازرونی المتوفی سنہ ۶۹۴ھ کی تصنیف ہے (۱)۔

سیرت ابن ابی طے:۔ مصنف کا نام یحییٰ بن حمیدۃ المتوفی سنہ ۶۳۰ھ ہے، یہ کتاب تین جلدوں میں ہے۔

سیرتِ مغلطائی (۲):۔ مشہور کتاب ہے، اور مصر میں چھپ گئی ہے، علامہ عینی نے اس کے ایک حصہ کی شرح لکھی ہے، جس کا نام کشف اللثام ہے۔

شرف المصطفیٰ:۔ حافظ ابو سعید عبدالملک نیشاپوری کی تصنیف ہے، آٹھ جلدوں میں ہے، حافظ ابن حجر اصابہ میں اکثر اس کا حوالہ دیتے ہیں لیکن جو روایتیں حافظ موصوف نے نقل کی ہیں، ان میں بعض نہایت مہمل اور لغو روایتیں ہیں، جس سے قیاس ہوتا ہے، کہ مصنف نے رطب و یابس کی کوئی تمیز نہیں رکھی ہے۔

شرف المصطفیٰ:۔ للحافظ ابن الجوزی۔

(۱) بمبئی کے کتب خانہ جامع مسجد میں اس کا قلمی نسخہ موجود ہے (۲) ان تمام کتابوں کا ذکر کشف الظنون میں سیرت کے عنوان میں ہے۔

اکتفا، فی مغازی المصطفیٰ والخلفاء الثلاثۃ، حافظ ابوالربیع سلیمان بن موسی الکلاعی المتوفی سنہ ۶۳۴ھ کی تصنیف ہے، اکثر کتابوں میں اس کے حوالے آتے ہیں۔

سیرت ابن عبدالبر، ابن عبدالبر مشہور محدث اور امام ہیں، اس کتاب کے حوالے اکثر آتے ہیں۔

عیون الاثر، ابن سید الناس کی تصنیف ہے، ابن سید الناس اندلس کے مشہور عالم ہیں، سنہ ۷۳۴ھ میں وفات پائی، یہ کتاب نہایت متین اور جامع ہے، معتبر کتابوں کو ماخذ قرار دیا ہے، اور جس سے جو کچھ نقل کیا ہے، سند بھی نقل کی ہے، اس کا قلمی نسخہ (جلد دوم) کلکتہ کے کتب خانہ میں ہے، اور ہمارے پیش نظر ہے۔

نور النبراس فی سیرۃ ابن سید الناس، عیون الاثر کی شرح ہے، مصنف کا نام ابراہیم ابن محمد ہے، یہ کتاب نہایت محققانہ لکھی گئی ہے، اور بے شمار معلومات کا گنجینہ ہے، دو ضخیم جلدوں میں ہے اور ندوہ کے کتب خانہ میں اس کا نہایت عمدہ نسخہ موجود ہے۔

سیرت منظوم، حافظ زین الدین عراقی نے جو حافظ ابن حجر کے استاد تھے، نظم میں لکھی ہے، لیکن دیباچہ میں خود لکھ دیا ہے کہ اس میں رطب و یابس سب کچھ ہے۔

مواہب لدنیہ: مشہور کتاب ہے اور متاخرین کا یہی ماخذ ہے، اس کے مصنف قسطلانی ہیں، جو بخاری کے مشہور شارح ہیں، حافظ ابن حجر کے ہم رتبہ تھے، یہ کتاب اگرچہ نہایت مفصل ہے، لیکن ہزاروں موضوع اور غلط روایتیں بھی موجود ہیں۔

زرقانی علی المواہب، یہ مواہب لدنیہ کی شرح ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ سہیلی کے بعد کوئی کتاب اس جامعیت اور تحقیق سے نہیں لکھی گئی، آٹھ ضخیم جلدوں میں ہے، اور مصر میں چھپ گئی ہے۔

سیرت حلبی: مشہور اور متداول ہے۔

صحت ماخذ سیرت نبویؐ کے واقعات جو قلمبند کئے گئے، وہ تقریباً نبوت کے ۱۰۰ سو برس کے بعد قلمبند ہوئے، اس لئے مصنفین کا ماخذ کوئی کتاب نہ تھی، بلکہ اکثر زبانی روایتیں تھیں۔

اس قسم کا موقع جب دوسری قوموں کو پیش آتا ہے، یعنی کسی زمانہ کے حالات مدت کے بعد قلمبند کئے جاتے ہیں، تو یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے، کہ ہر قسم کی بازاری افواہیں قلمبند کرلی جاتی ہیں، جن کے راویوں کا نام و نشان تک معلوم نہیں ہوتا، ان افواہوں میں سے وہ واقعات انتخاب کرلئے جاتے ہیں، جو قرائن اور قیاسات کے مطابق ہوتے ہیں، تھوڑی دیر کے بعد یہی خرافات ایک دلچسپ تاریخی کتاب بن جاتے ہیں، یورپ کی تاریخی تصنیفات اسی اصول پر لکھی گئی ہیں۔

اسلامی فن تاریخ کا پہلا اصول فن روایت لیکن مسلمانوں نے اس فن سیرت کا جو معیار قائم کیا، وہ اس سے بہت زیادہ بلند تھا، اس کا پہلا اصول یہ تھا، کہ جو واقعہ بیان کیا جائے، اس

شخص کی زبان سے بیان کیا جائے، جو خود شریک واقعہ تھا، اور اگر خود نہ تھا، تو شریک واقعہ تک تمام راویوں کا نام بہ ترتیب بتایا جائے، اس کے ساتھ یہ بھی تحقیق کیا جائے کہ جو اشخاص سلسلۂ روایت میں آئے کون لوگ تھے، ؟ کیسے تھے، ؟ کیا مشاغل تھے؟ چال چلن کیسا تھا، ؟ حافظہ کیسا تھا، ؟ سمجھ کیسی تھی، ؟ ثقہ تھے یا غیر ثقہ؟ سطحی الذہن تھے، یا دقیقہ بیں؟ عالم تھے یا جاہل؟ ان جزئی جزئی باتوں کا پتہ لگانا سخت مشکل بلکہ ناممکن تھا، سینکڑوں ہزاروں محدثین نے اپنی عمریں اسی کام میں صرف کردیں ایک ایک شہر میں گئے، راویوں سے ملے، ان کے متعلق ہر قسم کے معلومات بہم پہنچائے، جو لوگ ان کے زمانہ میں موجود نہ تھے، ان کے دیکھنے والوں سے حالات دریافت کئے۔

اسماء الرجال کی تدوین

ان تحقیقات کے ذریعہ سے اسماء الرجال (بیوگرافی) کا وہ عظیم الشان فن تیار ہوگیا، جس کی بدولت آج کم از کم لاکھ شخصوں کے حالات معلوم ہوسکتے ہیں، اور اگر ڈاکٹر اسپرنگر (۱) کے حسن ظن کا اعتبار کیا جائے تو یہ تعداد پانچ لاکھ پہنچ جاتی ہے۔

محدثین نے حالات کے بہم پہنچانے میں کسی شخص کے رتبہ اور حیثیت کی پروا نہ کی، بادشاہوں سے لے کر بڑے بڑے مقتداؤں تک کی اخلاقی سراغ رسانیاں کیں، اور ایک ایک کی پردہ دری کی۔

اس سلسلہ میں سیکڑوں تصنیفات تیار ہوئیں، جن کی اجمالی کیفیت یہ ہے۔

سب سے پہلے اس فن یعنی راویوں کی جرح وتعدیل میں یحییٰ بن سعید القطان نے ایک کتاب لکھی، وہ اس رتبہ کے شخص تھے، کہ امام احمد بن حنبل نے ان کی نسبت لکھا ہے کہ "میری آنکھوں نے ان کا نظیر نہیں دیکھا"۔ ان کے بعد اس فن کو زیادہ رواج ہوا، اور کثرت سے کتابیں لکھی گئیں، جن میں سے چند ممتاز تصنیفات حسب ذیل ہیں۔

نام مصنف	کیفیت
رجال عقیلی	خاص ضعیف الروایہ لوگوں کے حال میں ہے۔
رجال احمد بن عبد العجلی المتوفی سنہ ۲۶۱ھ	
رجال امام عبد الرحمن بن حاتم الرازی المتوفی سنہ ۳۲۷ھ	اس کتاب کا نام کتاب الجرح والتعدیل ہے بہت ضخیم کتاب ہے۔

(۱) ڈاکٹر اسپرنگر جرمن کے مشہور عربی داں فاضل ہیں، مدت تک ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں کام کیا، اصابہ کا نسخہ ان ہی کی تصحیح سے کلکتہ میں چھپا، اسی کتاب کے دیباچہ میں صاحب موصوف نے لکھا ہے کہ "نہ کوئی قوم دنیا میں ایسی گذری نہ آج موجود ہے، جس نے مسلمانوں کی طرح اسماء الرجال سا عظیم الشان فن ایجاد کیا ہو جس کی بدولت آج پانچ لاکھ شخصوں کا حال معلوم ہوسکتا ہے"۔

کیفیت	نام مصنف
مشہور محدّث ہیں، یہ کتاب خاص ضعیف الروایۃ اشخاص کے حال میں ہے۔	رجال امام دار قطنی
اس فن کی سب سے مشہور کتاب ہے، اور تمام محدثین متاخرین نے اس کو اپنا ماخذ قرار دیا ہے۔	کامل ابنِ عدی

یہ کتابیں قریباً آج ناپید ہیں، لیکن بعد کی تصنیفات، جو انہی سے ماخوذ ہیں، آج بھی موجود ہیں۔

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ جامع اور مستند کتاب تہذیب الکمال ہے، جو علامہ مزی (یوسف بن الزکی) کی تصنیف ہے، جنہوں نے سنہ ۴۲، ھ میں وفات پائی علاء الدین مغلطائی المتوفی سنہ ۶۲، ھ نے تیرہ جلدوں میں اس کا تکملہ لکھا۔

علامہ ذہبی المتوفی سنہ ۴۸، ھ نے اس کا اختصار کیا، اور بہت سے محدثین نے اس کے خلاصے اور ذیل لکھے، اور بالآخر حافظ ابن حجر نے ان تمام تصنیفات سے ایک نہایت ضخیم کتاب تہذیب التہذیب لکھی، جو بارہ جلدوں میں ہے، اور آج کل حیدر آباد سے شائع ہوئی ہے، مصنف نے کتاب کے خاتمہ میں لکھا ہے، کہ اس کی تصنیف میں آٹھ برس صرف ہوئے ہیں، اس سلسلہ کی ایک اور سب سے زیادہ متداول اور مستند کتاب میزان الاعتدال ہے، جو علامہ ذہبی کی تصنیف ہے، حافظ ابن حجر نے اس کتاب پر اضافہ کیا، جس کا نام لسان المیزان ہے۔

اسماء الرجال کی پیش نظر کتابیں

اسماء الرجال کی کتابوں میں سے تہذیب الکمال، تہذیب التہذیب، لسان المیزان، تقریب، تاریخ کبیر بخاری، تاریخ صغیر بخاری، ثقات ابن حبان، تذکرۃ الحفاظ علامہ ذہبی، مشتبہ النسبۃ ذہبی، انساب سمعانی، تہذیب الاسماء ہماری نظر سے گذری ہیں۔

تحقیق روایت کا اصول قرآن وحدیث میں

اس اصول تحقیق کی بنیاد خود قرآن مجید نے قائم کردی تھی۔

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا (حجرات - ۴۹ : ۶)

مسلمانو! اگر تمہارے پاس کوئی فاسق خبر لائے، تو تم اچھی طرح اس کی تحقیق کر لو۔

حدیث ذیل بھی اسی کی موید ہے۔

كفىٰ بالمرء كذبا ان يحدث بكل ما سمع۔

آدمی کے جھوٹے ہونے کی یہ کافی دلیل ہے کہ جو کچھ سنے روایت کردے۔

دوسرا اصول درایت

تحقیق واقعات کا دوسرا اصول یہ تھا کہ جو واقعہ بیان کیا جاتا ہے، عقلی شہادت کے مطابق بھی ہے یا نہیں؟

درایت کی ابتداء

یہ اصول بھی در حقیقت قرآن مجید ہی نے قائم کر دیا تھا، حضرت عائشہؓ پر جب منافقین نے تہمت لگائی تو اس طرح اس خبر کو مشہور کیا کہ بعض صحابہؓ تک مغالطہ میں آگئے، چنانچہ صحیح بخاری اور مسلم میں ہے، کہ حضرت حسانؓ بھی قاذفین میں شریک تھے، اور اسی بنا پر حدِ قذف جاری کی گئی، قرآن مجید میں بھی اس کی تصریح ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ جَآءُوْا بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ۔ (نور۔ ۲۴:۱۱)
جن لوگوں نے تہمت لگائی، وہ تمہارے گروہ میں سے ہیں۔

تفسیر جلالین میں مِنْكُمْ کی تفسیر حسب ذیل کی ہے۔

جماعة من المومنين
یعنی یہ تہمت لگانے والے، مسلمانوں کا ایک گروہ ہے۔

قرآن مجید کی آیتیں حضرت عائشہؓ کی براءت اور طہارت کے متعلق جو نازل ہوئیں، ان میں سے ایک یہ ہے۔

وَلَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ قُلْتُمْ مَّا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا سُبْحٰنَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ۔ (نور۔ ۲۴:۱۶)
اور جب تم نے سنا تو یہ کیوں نہیں کہہ دیا کہ ہم کو ایسی بات بولنا مناسب نہیں، سبحان اللہ یہ بڑا بہتان ہے۔

عام اصول کی بنا پر اس خبر کی تحقیق کا یہ طریقہ تھا کہ پہلے راویوں کے نام دریافت کئے جاتے، پھر دیکھا جاتا کہ وہ ثقہ اور صحیح الروایہ ہیں یا نہیں؟ پھر ان کی شہادت لی جاتی، لیکن خدا نے اس آیت میں فرمایا کہ سننے کے ساتھ تم نے کیوں نہیں کہہ دیا کہ یہ بہتان ہے۔

اس سے قطعاً ثابت ہوتا ہے کہ اس قسم کا خلافِ قیاس جو واقعہ بیان کیا جائے قطعاً سمجھ لینا چاہئیے کہ غلط ہے۔

اس طرز تحقیق یعنی درایت کی ابتداء خود صحابہؓ کے عہد میں ہو چکی تھی۔

فقہا میں بعض اس بات کے قائل ہیں کہ آگ پر پکی ہوئی چیز کے کھانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، حضرت ابو ہریرہؓ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے سامنے جب اس مسئلہ کو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف منسوب کیا تو حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے کہا کہ اگر یہ صحیح ہو تو اس پانی کے پینے سے بھی وضو ٹوٹ جائے گا جو آگ پر گرم کیا گیا ہو (۱)۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ حضرت ابو ہریرہؓ کو ضعیف الروایہ نہیں سمجھتے تھے، لیکن چونکہ ان کے نزدیک یہ روایت درایت کے خلاف تھی، اس لئے انھوں نے تسلیم نہیں کی، اور یہ خیال کیا کہ سمجھنے میں غلطی ہو گئی ہوگی۔

(۱) صحیح ترمذی باب الوضو۔

محدثین کے اصول درایت جب حدیثوں کی تدوین شروع ہوئی تو محدثین نے درایت کے اصول بھی منضبط کئے جن میں سے بعض یہ ہیں۔

قال(۱) ابن الجوزی و کل حدیث رأیته یخالف العقول او یناقض الاصول فاعلم انه موضوع فلا یتکلف اعتباره ای لا تعتبر رواته ولا تنظر فی جرحهم او یکون ممایدفعه الحس والمشاهدة او مباینا لنص الکتاب والسنة المتواترة او الاجماع القطعی حیث لا یقبل شئی من ذلک التاویل او یتضمن الافراط بالوعید الشدید علی الامر الیسیر او بالوعد العظیم علی الفعل الیسیر وهذا الاخیر کثیر موجود فی حدیث القصاص والصوفیة ومن رکة المعنی لا تاکلوا القرعة حتی تذبحوها ولذا جعل بعضهم ذلک دلیلا علی کذب راویه وکل هذا من القرائن فی المروی وقد تکون فی الراوی کقصة غیاث مع المهدی اوانفراده عمن لم یدرکه بما لم یوجد عند غیرهما او انفراده بشئی مع کونه مما

ابن جوزی نے کہا ہے کہ جس حدیث کو دیکھو کہ عقل یا اصول مسلمہ کے خلاف ہے تو جان لو کہ وہ مصنوعی ہے۔ اس کی نسبت اس بحث کی ضرورت نہیں کہ اس کے راوی معتبر ہیں یا غیر معتبر۔ اسی طرح سے وہ حدیث قابلِ اعتبار نہیں جو محسوسات اور مشاہدہ یا کتاب و سنت متواترہ یا اجماع قطعی کے خلاف ہو اور تاویل کی گنجائش نہ رکھتی ہو یا وہ حدیث جس میں ذرا سی بات پر سخت عذاب کی دھمکی ہو۔ یا معمولی کام پر بہت بڑا ثواب کا وعدہ ہو (اس قسم کی حدیثیں واعظوں اور صوفیوں کے ہاں پائی جاتی ہیں) یا وہ حدیث جس میں لغویت پائی جائے۔ مثلاً یہ حدیث کہ کدو کو بغیر ذبح کئے نہ کھاؤ۔ اس لئے بعض محدثین نے لغویت کو راوی کے کذب کی دلیل قرار دیا ہے۔ یہ تمام قرینے خود روایت سے متعلق ہیں اور کبھی یہ قرائن راوی کے متعلق ہوتے ہیں۔ مثلاً غیاث کا واقعہ مہدی کے ساتھ ... یا جب کہ راوی کوئی ایسی حدیث بیان کرے جو اور کسی نے۔ بیان کی ہو اور خود راوی جس سے روایت کرتا ہے۔ اس سے ملاقات نہ ہو۔ یا وہ حدیث جس کو ایک ہی راوی بیان کرتا ہے۔ حالانکہ بات ایسی ہے کہ اس سے اوروں کو بھی مطلع ہونا ضرور تھا جیسا کہ خطیب بغدادی

(۱) فتح المغیث مطبوعہ لکھنؤ ص ۱۱۴۔ افسوس یہ ہے کہ یہ کتاب نہایت غلط چھپی ہے۔ اس لئے بعض عبارتیں ہم نے اسی نسخہ کے موافق غلط نقل کی ہیں۔ یہ اصول خود ابن جوزی کے قائم کردہ نہیں ہیں بلکہ ابن جوزی نے محدثین کے اصول کو نقل کر دیا ہے۔ ۱۲

يلزم المكلفين علمه وقطع العذر فيه كما قرره الخطيب في اول الكفاية او بامر جسيم يتوفر الدواعي على نقله كحصر العدو للحاج عن البيت۔

نے کتاب الکفایہ کے شروع میں اس کی تصریح کی ہے، یا وہ روایت جس میں کسی عظیم الشان واقعہ کا ذکر ہے کہ اگر وہ واقع ہوا ہوتا تو سینکڑوں آدمی اس کو بیان کرتے، مثلاً یہ واقعہ کہ کسی دشمن نے حاجیوں کو کعبہ کے حج سے روک دیا۔

روایت کے اصول اس عبارت کا ماحصل یہ ہے کہ حسب ذیل صورتوں میں روایت اعتبار کے قابل نہ ہوگی اور اس کے متعلق اس تحقیق کی ضرورت نہیں کہ اس کے راوی معتبر ہیں یا نہیں۔

۱۔ جو روایت عقل کے مخالف ہو۔

۲۔ جو روایت اصول مسلمہ کے خلاف ہو۔

۳۔ محسوسات اور مشاہدہ کے خلاف ہو۔

۴۔ قرآن مجید یا حدیث متواتر یا اجماعِ قطعی کے خلاف ہو اور اس میں تاویل کی کچھ گنجائش نہ ہو۔

۵۔ جس حدیث میں معمولی بات پر سخت عذاب کی دھمکی ہو۔

۶۔ معمولی کام پر بہت بڑے انعام کا وعدہ ہو۔

۷۔ وہ روایت رکیک المعنی ہو، مثلاً کدو کو بغیر ذبح کئے نہ کھاؤ۔

۸۔ جو راوی کسی شخص سے ایسی روایت کرتا ہے کہ کسی اور نے نہیں کی اور یہ راوی اس شخص سے نہ ملا ہو۔

۹۔ جو روایت ایسی ہو کہ تمام لوگوں کو اس سے واقف ہونے کی ضرورت ہو باایں ہمہ ایک راوی کے سوا کسی اور نے اس کی روایت نہ کی ہو۔

۱۰۔ جس روایت میں ایسا قابل اعتنا واقعہ بیان کیا گیا ہو کہ اگر وقوع میں آتا، تو سینکڑوں آدمی اس کو روایت کرتے، باوجود اس کے صرف ایک ہی راوی نے اس کی روایت کی ہو۔

موضوع حدیثوں کی شناخت کے اصول ملا علی قاری نے موضوعات (۱) کے خاتمہ میں حدیثوں کے نامعتبر ہونے کے چند اصول تفصیل سے لکھے ہیں اور ان کی مثالیں نقل کی ہیں، ہم اس کا خلاصہ اس موقع پر نقل کرتے ہیں۔

۱۔ جس حدیث میں فضول باتیں ہوں، جو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زبان سے نہیں نکل سکتیں، مثلاً یہ کہ جو شخص لا الہ الا اللہ کہتا ہے، خدا اس کلمہ سے ایک پرند پیدا کرتا ہے

(۱) نسخہ مطبوعہ مجتبائی دہلی، صفحہ ۹۲ تا خاتمہ کتب۔

جس کے ستر، زبانیں ہوتی ہیں، ہر زبان میں ستر، ہزار لغت ہوتے ہیں" الخ"۔

۲۔ وہ حدیث جو مشاہدہ کے خلاف ہو، مثلاً یہ حدیث کہ "بیگن کھانا ہر مرض کی دوا ہے"۔

۳۔ وہ حدیث جو صریح حدیثوں کے مخالف ہو۔

۴۔ جو حدیث واقع کے خلاف ہو مثلاً یہ کہ دھوپ میں رکھے ہوئے پانی سے غسل نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ اس سے برص پیدا ہوتا ہے۔

۵۔ وہ حدیث جو انبیاء علیہم السلام کے کلام سے مشابہت نہ رکھتی ہو، مثلاً یہ حدیث کہ "تین چیزیں نظر کو ترقی دیتی ہیں، سبزہ زار، آب رواں، خوبصورت چہرہ کا دیکھنا"۔

۶۔ وہ حدیثیں جن میں آیندہ واقعات کی پیشین گوئی بقید تاریخ مذکور ہوتی ہے، مثلاً یہ کہ "فلاں سنہ اور فلاں تاریخ میں یہ واقعہ پیش آئے گا"۔

۷۔ وہ حدیثیں جو طبیبوں کے کلام سے مشابہ ہیں، مثلاً یہ کہ "ہریسہ کے کھانے سے قوت آتی ہے" یا یہ کہ "مسلمان شیریں ہوتا ہے، اور شیرینی پسند کرتا ہے"۔

۸۔ وہ حدیث جس کے غلط ہونے کے دلائل موجود ہیں، مثلاً عوج بن عنق کا قد تین ۳ ہزار گز کا تھا۔

۹۔ وہ حدیث جو صریح قرآن کے خلاف ہو، مثلاً دنیا کی عمر سات ہزار برس کی ہے، کیونکہ اگر یہ روایت صحیح ہو تو ہر شخص بتا دے گا، کہ قیامت کے آنے میں اس قدر دیر ہے، حالانکہ قرآن سے ثابت ہے کہ قیامت کا وقت کسی کو معلوم نہیں۔

۱۰۔ وہ حدیثیں جو خضر علیہ السلام کے متعلق ہیں۔

۱۱۔ جس حدیث کے الفاظ رکیک ہوں۔

۱۲۔ وہ حدیثیں جو قرآن مجید کی الگ الگ سورتوں کے فضائل میں وارد ہیں، حالانکہ یہ حدیثیں تفسیر بیضاوی اور کشاف وغیرہ میں منقول ہیں۔

ان اصول سے محدثین نے اکثر جگہ کام لیا، اور ان کی بنا پر بہت سی روایتیں رد کر دیں، مثلاً ایک واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ "آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے خیبر کے یہودیوں کو جزیہ سے معاف کر دیا تھا، اور معافی کی دستاویز لکھوا دی تھی" ملا علی قاری اس روایت کے متعلق لکھتے ہیں، کہ یہ روایت مختلف وجوہ سے باطل ہے۔

۱۔ اس معاہدہ پر سعد بن معاذؓ کی گواہی بیان کی جاتی ہے، حالانکہ وہ غزوۂ خندق میں وفات پا چکے تھے۔

۲۔ دستاویز میں کاتب کا نام معاویہ ہے، حالانکہ وہ فتح مکہ میں اسلام لائے۔

۳۔ اس وقت تک جزیہ کا حکم ہی نہیں آیا تھا، جزیہ کا حکم قرآن مجید میں جنگ تبوک کے بعد نازل ہوا ہے۔

۴۔ دستاویز میں تحریر ہے کہ "یہودیوں سے بیگار نہیں لی جائے گی" حالانکہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے زمانہ میں بیگار کا رواج ہی نہ تھا۔

۵۔ خیبر والوں نے اسلام کی سخت مخالفت کی تھی، ان سے جزیہ کیوں معاف کیا جاتا۔

۶۔ عرب کے دور دراز حصوں میں جب جزیہ معاف نہیں ہوا، حالانکہ ان لوگوں نے چنداں مخالفت اور دشمنی نہیں کی تھی، تو خیبر والے کیونکر معاف ہو سکتے تھے۔

۷۔ اگر جزیہ ان کو معاف کر دیا گیا ہوتا تو یہ اس بات کی دلیل تھی، کہ وہ اسلام کے ہوا خواہ اور دوست اور واجب الرعایۃ ہیں، حالانکہ چند روز کے بعد خارج البلد کر دئے گئے۔

تبصرہ

(فن سیرت پر)

سیرت کی یہ ایک اجمالی اور سادہ تاریخ تھی، اب ہم اس پر مختلف پہلوؤں سے نظر ڈالنا چاہتے ہیں

امہات کتب سیرت

۱۔ سیرت پر اگرچہ آج بھی سیکڑوں تصنیفیں موجود ہیں، لیکن سب کا سلسلہ جا کر صرف تین ۳ چار ۴ کتابوں پر منتہی ہوتا ہے، سیرت ابن اسحاق، واقدی، ابن سعد، طبری، ان کے علاوہ جو کتابیں ہیں، وہ ان سے متاخر ہیں، اور ان میں جو واقعات مذکور ہیں، زیادہ تر ان ہی کتابوں سے لئے گئے ہیں، (کتب حدیث کا جو ٹکڑا ہے، اس سے اس مقام پر بحث نہیں) اس بنا پر ہم کو مذکورہ بالا کتابوں پر زیادہ تفصیل اور تدقیق سے نظر ڈالنی چاہیے۔

ان میں سے واقدی تو بالکل نظر انداز کر دینے کے قابل ہے، محدثین بالاتفاق لکھتے ہیں، کہ وہ خود اپنے جی سے روایتیں گھڑتا ہے، اور حقیقت میں واقدی کی تصنیف خود اس بات کی شہادت ہے، ایک ایک جزئی واقعہ کے متعلق جس قسم کی گوناگوں اور دلچسپ تفصیلیں وہ بیان کرتا ہے، آج کوئی بڑا سے بڑا واقعہ نگار چشم دید واقعات اس طرح قلمبند نہیں کر سکتا۔

واقدی کے سوا باقی اور تینوں مصنفین، اعتبار کے قابل ہیں، ابن اسحاق کی نسبت اگرچہ امام مالک اور بعض محدثین نے جرح کی ہے، تاہم ان کا یہ رتبہ ہے، کہ امام بخاری اپنے رسالہ "جزء القراءۃ" میں ان کی سند سے روایتیں نقل کرتے ہیں، اور ان کو صحیح سمجھتے ہیں، ابن سعد اور طبری میں کسی کو کلام نہیں، لیکن افسوس ہے کہ ان لوگوں کا مستند ہونا، ان کی تصنیفات کے مستند ہونے پر چنداں اثر نہیں ڈالتا، یہ لوگ خود شریک واقعہ نہیں، اس لئے جو کچھ بیان کرتے ہیں اور اور راویوں کے ذریعہ سے بیان کرتے ہیں، لیکن ان کے بہت سے رواۃ ضعیف الروایہ اور غیر مستند ہیں، اس کے علاوہ ابن اسحاق کی اصلی کتاب (ہندوستان میں) موجود نہیں، ابن ہشام نے ابن اسحاق کی کتاب کو ترتیب اور تہذیب کے بعد جس صورت میں بدل دیا، وہی آج موجود ہے، لیکن ابن ہشام نے ابن اسحاق کی کتاب کو زیاد بکائی کے واسطہ سے روایت کیا ہے، بکائی اگرچہ رتبہ

کے شخص ہیں، تاہم محدثین کے اعلیٰ معیار سے فروتر ہیں۔ ابن مدینی (امام بخاری کے استاد) کہتے ہیں کہ "وہ ضعیف ہے، اور میں نے اس کو ترک کر دیا"۔ ابو حاتم کہتے ہیں، وہ استناد کے قابل نہیں، نسائی کہتے ہیں، "وہ ضعیف ہے"۔

ابن سعد کی نصف سے زیادہ روایتیں واقدی کے ذریعہ سے ہیں، اس لئے ان روایتوں کا وہی رتبہ ہے۔ جو خود واقدی کی روایتوں کا ہے، باقی رواۃ میں سے بعض ثقہ ہیں اور بعض غیر ثقہ۔

طبریؔ کے بڑے بڑے شیوخ روایت مثلاً سلمۃ ابرش، ابن سلمۃ وغیرہ ضعیف الروایۃ ہیں۔

اس بنا پر مجموعی حیثیت سے سیرت کا ذخیرہ، کتب حدیث کا ہم پلہ نہیں، البتہ ان میں سے تحقیق و تنقید کے معیار پر جو اتر جائے، وہ حجت اور استناد کے قابل ہے۔

کتب حدیث و سیرۃ میں فرق مراتب

سیرت کی کتابوں کی کم پائگی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ تحقیق اور تنقید کی ضرورت احادیث احکام کے ساتھ مخصوص کر دی گئی، یعنی وہ روایتیں تنقید کی زیادہ محتاج ہیں، جن سے شرعی احکام ثابت ہوتے ہیں، باقی جو روایتیں سیرت اور فضائل وغیرہ سے متعلق ہیں، ان میں تشدد اور احتیاط کی چنداں ضرورت نہیں، حافظ زین الدین عراقی جو بہت بڑے پایہ کے محدث ہیں، سیرت منظوم کے دیباچہ میں لکھتے ہیں۔

ولیعلم الطالب ان السیرا	طالب کو جاننا چاہیئے کہ سیرت میں سبھی طرح
تجمع ماصح و ماقد انکرا	کی روایتیں ہوتی ہیں، صحیح بھی اور غلط بھی۔

فن سیرت میں محدثین کی مسامحت

یہی وجہ ہے کہ مناقب اور فضائل اعمال میں کثرت سے ضعیف روایتیں، شائع ہو گئیں، اور بڑے بڑے علماء نے اپنی کتابوں میں ان روایتوں کا درج کرنا جائز رکھا، علامہ ابن تیمیہ کتاب التوسل (۱) میں لکھتے ہیں۔

قدرواہ من صنف فی عمل یوم ولیلۃ کابن السنی و ابی نعیم وفی مثل ھذہ الکتب احادیث کثیرۃ موضوعۃ لا یجوز الا عتماد علیھا فی الشریعۃ با تفاق العلماء	اس حدیث کو ان لوگوں نے روایت کیا ہے جنہوں نے رات دن کے اعمال میں کتابیں تصنیف کی ہیں، مثلاً ابن السنی اور ابو نعیم اور اس قسم کی کتابوں میں کثرت سے جھوٹی حدیثیں موجود ہیں، جن پر اعتماد کرنا ناجائز ہے اور اس پر تمام علماء کا اتفاق ہے۔

حاکم نے مستدرک میں یہ حدیث روایت کی ہے، کہ جب حضرت آدمؑ سے خطا سرزد ہوئی تو انہوں نے کہا "اے خدا میں تجھ کو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا واسطہ دیتا ہوں کہ میری خطا معاف کر دے"۔ خدا نے کہا "تم نے محمد کو کیونکر جانا" حضرت آدمؑ نے کہا "میں نے سر اٹھا کر عرش کے پایوں پر نظر ڈالی تو یہ الفاظ لکھے ہوئے دیکھے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ اس سے

(۱) مطبوعہ مطبع المنار ص ۹۹۔

میں نے قیاس کیا کہ تو نے اپنے نام کے ساتھ جس شخص کا نام ملایا ہے، وہ ضرور تجھ کو محبوب ترین خلق ہوگا" خدا نے کہا" آدم! تم نے سچ کہا، اور محمدؐ نہ ہوتے تو میں تم کو پیدا بھی نہ کرتا" حاکم نے اس حدیث کو نقل کر کے لکھا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ علامہ ابن تیمیہ حاکم کا یہ قول نقل کر کے لکھتے ہیں۔

واما تصحیح الحاکم لمثل هذا الحدیث وامثاله فهذا مما انکره علیه ائمة العلم بالحدیث و قالوا ان الحاکم یصحح احادیث وهی موضوعة مکذوبة عند اهل المعرفة بالحدیث...... وکذالک احادیث کثیرة فی مستدرکه یصححها وهی عندائمة اهل العلم بالحدیث موضوعة (۱)

حاکم کا اس قسم کی حدیثوں کو صحیح کہنا ائمہ حدیث نے اس پر انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ حاکم بہت سی جھوٹی اور موضوع حدیثوں کو صحیح کہتے ہیں، اسی طرح حاکم کی مستدرک میں بہت سی حدیثیں ہیں، جن کو حاکم نے صحیح کہا ہے، حالانکہ وہ ائمہ حدیث کے نزدیک موضوع ہیں۔

علامہ موصوف ایک اور موقع پر ابوالشیخ اصفہانی کی کتاب کا تذکرہ کر کے لکھتے ہیں۔ (ص ۱۰۵ و ۱۰۶)

وفیها احادیث کثیرة قویة صحیحة وحسنة واحادیث کثیرة ضعیفة موضوعة واهیة وکذالک ما یرویه خیثمة بن سلیمان فی فضائل الصحابة وما یرویه ابو نعیم الا صبهانی فی فضائل الخلفاء فی کتاب مفرد وفی اول حلیة الاولیا......
وما یرویه ابو بکر الخطیب و ابوالفضل بن ناصر وابو موسی المدینی وابو القاسم بن عساکر

اور اس میں بہت سی حدیثیں ہیں جو قوی ہیں صحیح ہیں اور حسن ہیں، اور بہت سی ضعیف اور موضوع اور مہمل ہیں اور اسی طرح وہ حدیثیں جو خثیمہ بن سلیمان صحابہؓ کے فضائل میں روایت کرتے ہیں، اور وہ حدیثیں جو ابو نعیم اصفہانی نے ایک مستقل کتاب میں خلفاء کے فضائل میں روایت کی ہیں اور اسی طرح وہ روایتیں جو ابوبکر خطیب اور ابوالفضل اور ابو موسیٰ مدینی اور

(۱) کتاب التوسل مطبوعہ المنار ص ۱۰۱ (نیز تذکرة الحفاظ ذہبی ترجمہ حاکم)

ابن عساکر اور حافظ عبدالغنی وغیرہ اور ان کے پایہ کے لوگ، روایت کرتے ہیں۔ والحافظ عبدالغنی وامثالھم ممن لہ معرفۃ بالحدیث۔

غور کرو، ابو نعیم، خطیب بغدادی، ابن عساکر، حافظ عبدالغنی وغیرہ حدیث اور روایت کے امام تھے، باوجود اس کے یہ لوگ خلفاء اور صحابہؓ کے فضائل میں ضعیف حدیثیں بے تکلف روایت کرتے تھے، اس کی وجہ یہی تھی کہ یہ خیال عام طور پر پھیل گیا تھا، کہ صرف حلال و حرام کی حدیثوں میں احتیاط اور تشدد کی ضرورت ہے، ان کے سوا اور روایتوں میں سلسلہ سند نقل کر دینا کافی ہے، تنقید اور تحقیق کی ضرورت نہیں۔

موضوعات ملا علی قاری میں لکھا ہے کہ بغداد میں ایک واعظ نے یہ حدیث بیان کی کہ "قیامت میں خدا آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اپنے ساتھ عرش پر بٹھائے گا"۔ امام ابن جریر طبری نے سنا تو بہت برہم ہوئے، اور اپنے دروازہ پر یہ فقرہ لکھ دیا کہ "خدا کا کوئی ہم نشین نہیں"۔ اس پر بغداد کے عوام سخت برافروختہ ہوئے، اور امام موصوف کے گھر پر اس قدر پتھر برسائے کہ دیواریں ڈھک گئیں (۱)۔

اس موقع پر ایک خاص نکتہ لحاظ کے قابل ہے، یہ مسلّم ہے کہ حدیث و روایت میں امام بخاری اور امام مسلم سے بڑھ کر کوئی شخص کامل فن نہیں پیدا ہوا، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ ان کو جو عقیدت اور خلوص اور شیفتگی تھی اس کے لحاظ سے بھی وہ تمام محدثین پر ممتاز تھے، باوجود اس کے فضائل و مناقب کے متعلق جس قسم کی مبالغہ آمیز روایتیں بیہقی، ابو نعیم، بزار طبرانی وغیرہ میں پائی جاتی ہیں، بخاری اور مسلم میں ان کا پتہ نہیں لگتا، بلکہ اس قسم کی حدیثیں جو نسائی، ابن ماجہ، ترمذی وغیرہ میں پائی جاتی ہیں، صحیحین میں وہ بھی مذکور نہیں، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جس قدر تحقیق و تنقید کا درجہ بڑھتا جاتا ہے، مبالغہ آمیز روایتیں گھٹتی جاتی ہیں، مثلاً یہ روایت کہ جب آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) عالم وجود میں آئے تو ایوان کسریٰ کے ۱۴ کنگرے گر پڑے، آتش فارس بجھ گئی، بحیرۂ طبریہ خشک ہو گیا، بیہقی، ابو نعیم، خرائطی، ابن عساکر اور ابن جریر نے روایت کی ہے، لیکن صحیح بخاری اور مسلم بلکہ صحاح ستہ کی کسی کتاب میں اس کا پتہ نہیں۔

سیرت پر جو کتابیں لکھی گئیں وہ زیادہ تر اسی قسم کی کتابوں (طبرانی، بیہقی، ابو نعیم وغیرہ) سے ماخوذ ہیں، اس لئے ان میں کثرت سے کمزور روایتیں درج ہو گئیں، اور اسی بنا پر محدثین کو کہنا پڑا کہ سیر میں ہر قسم کی روایتیں ہوتی ہیں۔

محدثین نے جو اصول قرار دیئے تھے، سیرت کی روایتوں میں لوگوں نے اکثر نظر انداز کر دیئے۔ محدثین کا سب سے پہلا اصول یہ ہے کہ روایت کا سلسلہ اصل واقعہ تک کہیں منقطع نہ ہونے پائے لیکن آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حالات ولادت کے متعلق جس قدر روایتیں

---

(۱) موضوعات ملا علی قاری، ص ۱۳، مطبوعہ دہلی۔

مذکور ہیں، اکثر منقطع ہیں، صحابہ میں سے کوئی شخص ایسا نہیں، جس کی عمر آنحضرتؐ کی ولادت کے وقت روایت کے قابل ہو، سب سے معمر حضرت ابوبکرؓ ہیں، وہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے عمر میں دو برس کم تھے، اسی بنا پر میلاد کے متعلق جس قدر روایتیں ہیں، ان میں سے اکثر متصل نہیں اور اسی بنا پر بہت دور از کار روایتیں پھیل گئیں، مثلاً ابو نعیم نے آنحضرتؐ کی والدہ ماجدہ کی زبانی روایت کی ہے، کہ جب آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) پیدا ہوئے تو بہت سے پرند آکر مکان میں بھر گئے، جن کی زمرد کی منقار اور یاقوت کے پر تھے، پھر ایک سفید بادل آیا، اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اٹھا لے گیا، اور ندا آئی کہ اس بچہ کو مشرق و مغرب اور تمام دریاؤں کی سیر کراؤ کہ سب لوگ پہچان لیں (۱)۔

مغازی کا بڑا حصہ امام زہری سے منقول ہے لیکن ان کی اکثر روایتیں، جو سیرت ابن ہشام اور طبقات ابن سعد وغیرہ میں مذکور ہیں، منقطع ہیں۔

تصانیف سیرت میں کتب احادیث کیطرف سے بے اعتنائی

۲۔ نہایت تعجب انگیز بات یہ ہے، کہ جن بڑے بڑے نامور مصنفین مثلاً امام طبری وغیرہ نے سیرت پر جو کچھ لکھا، اس میں اکثر جگہ مستند احادیث کی کتابوں سے کام نہیں لیا۔

بعض واقعات نہایت اہم ہیں، ان کے متعلق حدیث کی کتابوں میں ایسے مفید معلومات موجود ہیں، جن سے تمام مشکل حل ہو جاتی ہے، لیکن سیرت اور تاریخ میں ان معلومات کا ذکر نہیں مثلاً یہ امر کہ جب آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے گئے تو لڑائی کی سلسلہ جنبانی کس کی طرف سے شروع ہوئی؟ ایک بحث طلب واقعہ ہے، تمام ارباب سیر اور مورخین کی تصریحات سے ثابت ہوتا ہے، کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ابتدا کی، لیکن سنن ابی داؤد میں صاف اور صریح حدیث موجود ہے، کہ جنگ بدر سے پہلے کفار مکہ نے عبداللہ بن اُبی کو یہ خط لکھا کہ تم نے محمدؐ کو اپنے شہر میں پناہ دی ہے، ان کو نکال دو، ورنہ ہم خود مدینہ آکر تمہارا اور محمدؐ دونوں کا استیصال کر دینگے (۲)، سیرت اور تاریخ کی کتابوں میں یہ واقعہ سرے سے منقول نہیں۔

مصنفین سیرت میں سے بعض لوگوں نے اس نکتہ کو سمجھا، اور جب احادیث کی زیادہ چھان بین کی تو ان کو تسلیم کرنا پڑا کہ سیرت کی کتابوں میں بہت سی روایتیں صحیح حدیثوں کے خلاف درج ہو گئی ہیں، لیکن چونکہ ان کی تصنیف پھیل چکی تھی، اس لئے اس کی اصلاح نہ ہو سکی، حافظ ابن حجر ایک موقع پر دمیاطی کا ایک قول نقل کر کے لکھتے ہیں۔

(۱) مواہب لدنیہ میں یہ روایت نقل کی ہے، اس میں بے انتہا مبالغہ آمیز باتیں ہیں، میں نے معمولی ٹکڑا نقل کر دیا ہے۔
(۲) غزوۂ بدر کے موقع پر ہم اس حدیث کے اصلی الفاظ نقل کریں گے۔

ودلّ هذا علی انّه کان یعتقد الرجوع عن کثیر ممّا وافق فیه اھل السیر وخالف الاحادیث الصحیحة وانّ ذالک کان منه قبل تضلّعه منہا ولخروج نسخ کتابه وانتشاره لم یتمکن من (۱) تغیره۔

یہ قول اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اکثر واقعات جن میں دمیاطی نے اہل سیر کی موافقت اور صحیح حدیثوں کی مخالفت کی تھی، اپنی رائے سے رجوع کیا۔ لیکن چونکہ کتاب کے نسخے پھیل گئے تھے، اس لئے اس کی اصلاح نہ کر سکے۔

مصنفین سیرت کی تدلیس

۳۔ سیرت میں اگلوں نے جو کتابیں لکھیں ان سے مابعد کے لوگوں نے جو روایتیں نقل کیں، انہی کے نام سے کیں، ان کے مستند ہونے کی بنا پر لوگوں نے ان تمام روایتوں کو معتبر سمجھ لیا، اور چونکہ اصل کتابیں ہر شخص کو ہاتھ نہیں آسکتی تھیں، اس لئے لوگ راویوں کا پتہ نہ لگا سکے، اور رفتہ رفتہ یہ روایتیں تمام کتابوں میں داخل ہو گئیں، اس تدلیس کا یہ نتیجہ ہوا کہ مثلاً جو روایتیں واقدی کی کتاب میں مذکور ہیں، ان کو لوگ عموماً غلط سمجھتے ہیں، لیکن ان ہی روایتوں کو جب ابن سعد کے نام سے نقل کر دیا جاتا ہے تو لوگ ان کو معتبر سمجھتے ہیں حالانکہ ابن سعد کی اصلی کتاب ہاتھ آئی تو پتہ لگا کہ ابن سعد نے اکثر روایتیں واقدی ہی سے لی ہیں۔

اصول روایت سے ہر جگہ کام نہیں لیا گیا

۴۔ روایت کے متعلق جو اصول منضبط ہوئے، صحابہ کے متعلق ان سے بعض بعض موقعوں پر کام نہیں لیا گیا، مثلاً اصول روایت کی رو سے رواۃ کے مختلف مدارج ہیں، کوئی راوی نہایت ضابط، نہایت معنی فہم، نہایت دقیقہ رس ہوتا ہے، کسی میں یہ اوصاف کم ہوتے ہیں، کسی میں اور بھی کم ہوتے ہیں، یہ فرق مراتب جس طرح فطرۃً عام راویوں میں پایا جاتا ہے، صحابہؓ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں، حضرت عائشہؓ نے حضرت عبداللہ ابن عمرؓ اور حضرت ابوہریرہؓ کی روایت پر اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت پر جو تنقیدیں کیں، اور جن کا ذکر اوپر گذر چکا، اسی بنا پر کیں۔

روایت میں اختلاف مراتب

اختلاف مراتب کی بنیاد پر بڑے بڑے معرکۃ الآرا مسائل کی بنیاد قائم ہے، مثلاً دو روایتوں میں تعارض پیش آجائے تو اس بحث کے فیصلہ میں صحیح طریقہ یہ خیال کیا جاتا ہے، کہ ایک روایت کے راویوں کا دوسری روایت کے راویوں سے عالی رتبہ ہونا ثابت کر دیا جائے، (گو دونوں راوی ثقہ ہیں) اور یہ اس روایت کی ترجیح کا قطعی ذریعہ ہوگا۔

---

(۱) زرقانی، جلد ۳ ص ۱۱۔

تمام صحابہ کے عدول ہونے کی بحث

لیکن صحابہؓ میں آکر یہ اصول بیکار ہوجاتا ہے، فرض کرو ایک روایت صرف حضرت عمرؓ ہی سے مروی ہے، اور دوسری کسی بدوی عرب سے مروی ہے، جس نے عمر بھر میں صرف ایک دفعہ اتفاقاً آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دیکھ لیا تھا، تو اب دونوں روایتوں کا رتبہ برابر ہوجاتا ہے، علامہ مازری مشہور محدث ہیں، علامہ نودی شرح صحیح مسلم میں اکثر ان سے استناد کرتے ہیں، انہوں نے اس تعمیم کی مخالفت کی تھی، چنانچہ حافظ ابن حجر نے اصابہ کے دیباچہ (ص ۱۰و۱۱) میں ان کا یہ قول نقل کیا ہے۔

لسنا نعني بقولنا الصحابة عدول كل من رآه (صلى الله عليه وسلم) يوما ما اوزاره لماماً او اجتمع به لغرض وانصرف عن كثب وانما نعني به الذين لازموه وعزروه ونصروه واتبعوا النور الذي انزل معه اولئك هم المفلحون•

یہ مقولہ کہ صحابہ عادل ہیں، ہم اس سے ہر ایسے شخص کو مراد نہیں لیتے جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اتفاقاً دیکھ لیا، یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی غرض کے لئے ملا، اور پھر فوراً واپس چلا گیا، بلکہ ہم ان لوگوں کو مراد لیتے ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بالتزام رہے اور آپ کی اعانت و مدد کی اور اس نور کی پیروی کی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا، یہی لوگ کامیاب ہیں۔

لیکن محدثین نے مازری کے اس قول سے عام مخالفت کی، علامہ مازری نے بے شبہ یہ غلطی کی کہ عدالت کے وصف کو مطلقاً مقربین صحابہؓ سے مخصوص کردیا، اس بنا پر محدثین کی مخالفت ان سے بیجا نہیں، لیکن اس میں کیا شبہ ہوسکتا ہے، کہ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ و علیؓ کی روایتیں ایک عام بدوی کی روایت کے برابر نہیں ہوسکتیں، خصوصاً ان روایتوں کے متعلق یہ فرق ضرور ملحوظ رکھنا چاہئیے جو فقہی مسائل یا دقیق مطالب سے تعلق رکھتی ہیں۔

واقعات میں سلسلۂ علت و معلول نہیں قائم کیا گیا

۵۔ ارباب سیر اکثر واقعات کے اسباب و علل سے بحث نہیں کرتے، نہ ان کی تلاش و تحقیق کی طرف متوجہ ہوتے، اگرچہ اس میں شبہ نہیں، کہ اس باب میں یورپ کا طریقہ نہایت غیر معتدل ہے، یورپین مورخ ہر واقعہ کی علت تلاش کرتا ہے، اور نہایت دور دراز قیاسات اور احتمالات سے سلسلۂ معلولات پیدا کرتا ہے، اس میں بہت کچھ اس کی خود غرضی اور خاص مطمح نظر کو دخل ہوتا ہے، وہ اپنے مقصد کو ایک محور بنالیتا ہے، تمام واقعات اسی کے گرد گردش کرتے ہیں، بخلاف اس کے اسلامی مورخ نہایت سچائی اور انصاف، اور خالص بے طرفداری سے واقعات کو ڈھونڈتا ہے، اس کو اس سے کچھ غرض نہیں ہوتی، کہ واقعات کا اثر اس کے مذہب پر، معتقدات پر،

اور تاریخ پر کیا پڑے گا، اس کا قبلۂ مقصد صرف واقعیت ہوتی ہے، وہ اس پر اپنے معتقدات اور قومیت کو بھی قربان کر دیتا ہے۔

لیکن اس میں حد سے زیادہ تفریط ہو گئی، اس بات سے بچنے کے لئے کہ واقعات رائے سے مخلوط نہ ہو جائیں، وہ پاس پاس کے ظاہری اسباب پر بھی نظر نہیں ڈالتا، اور ہر واقعہ کو خشک اور ادھورا چھوڑ دیتا ہے، مثلاً اکثر لڑائیوں کو اس طرح شروع کرتے ہیں، کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فلاں قبیلہ پر فلاں وقت فوجیں بھیج دیں، لیکن اس کے اسباب کا ذکر مطلق نہیں کرتے، جس سے عام ناظرین پر یہ اثر پڑتا ہے، کہ کفار پر حملہ کرنے، اور ان کو تباہ و برباد کرنے کے لئے کسی سبب اور وجہ کی ضرورت نہیں، صرف یہ عام وجہ کافی ہے، کہ وہ کافر ہیں، اسی سے مخالفین یہ استدلال کرتے ہیں کہ اسلام تلوار سے پھیلا ہے، حالانکہ زیادہ چھان بین سے ثابت ہوتا ہے، کہ جن قبائل پر فوجیں گئیں، وہ پہلے سے آمادۂ جنگ، اور مسلمانوں پر حملہ کی تیاریاں کر چکے تھے۔

نوعیت واقعہ کے لحاظ سے شہادت کا معیار نہیں قائم کیا گیا

۶۔ یہ لحاظ رکھنا ضرور ہے کہ واقعہ کی نوعیت کے بدلنے سے شہادت اور روایت کی حیثیت کہاں تک بدل جاتی ہے، مثلاً ایک راوی جو ثقہ ہے، ایک ایسا معمولی واقعہ بیان کرتا ہے، جو عموماً پیش آتا ہے، اور پیش آسکتا ہے، تو بے تکلف یہ روایت تسلیم کر لی جائیگی، لیکن فرض کرو وہی راوی ایسا واقعہ بیان کرتا ہے، جو غیر معمولی ہے، تجربہ عام کے خلاف ہے، گرد و پیش کے واقعات سے مناسبت نہیں رکھتا تو واقعہ چونکہ زیادہ محتاج ثبوت ہے، اس لئے اب راوی کا معمولی درجہ وثوق کافی نہیں ہو سکتا، بلکہ اس کو معمولی درجہ سے زیادہ عادل، زیادہ محتاط، زیادہ نکتہ دان ہونا چاہئیے۔

کم سن راویوں کی روایت

مثلاً ایک بحث یہ ہے کہ روایت کرنے کے لئے کسی عمر کی قید ہے یا نہیں؟ اکثر محدثین کا مذہب ہے، کہ ۵ برس کا لڑکا حدیث کی روایت کر سکتا ہے، یا مثلاً اگر کسی صحابی نے ۵ برس کی عمر میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے کسی قول یا فعل کی روایت کی، تو قابل اعتبار ہو گی، محدثین کا اس پر استدلال یہ ہے، کہ محمود بن الربیعؓ ایک صحابی تھے، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے وفات فرمانے کے وقت وہ پانچ برس کے بچے تھے، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک دفعہ اظہار محبت کے طور پر ان کے منہ پر کلی کا پانی ڈال دیا تھا، اس واقعہ کو انہوں نے جوان ہو کر لوگوں سے بیان کیا، اور سب نے یہ روایت قبول کی، اس سے ثابت ہوا، کہ ۵ برس کی عمر کی روایت قبول ہو سکتی ہے (۱)۔

اس کے برخلاف بعض محدثین کی رائے ہے، کہ کم سن کی روایت قابل حجت نہیں، فتح المغیث میں ہے۔

(۱) یہ پوری بحث فتح المغیث صفحہ ۱۶۶ تا ۱۶۸ میں ہے۔

ولكن قد منع قوم القبول هنا اى فى مسئلة الصبى خاصة فلم يقبلوا من تحمل قبل البلوغ لان الصبى مظنّة عدم الضبط وهو وجه للشافعية .... وكذا كان ابن المبارک يتوقف فى تحديث الصبى (کتاب مذکور ص ۱۶۴)

(لیکن ایک جماعت یہاں قبول روایت سے منع کرتی ہے، خصوصًا بچوں کی روایت کے مسئلہ میں، بلوغ سے پہلے جو روایت کسی بچہ نے سنی ہو، اس کو وہ قبول نہیں کرتی، شوافع کی یہی رائے ہے، اسی طرح عبداللہ ابن مبارک بھی بچہ کی روایت حدیث کرنے میں توقف کرتے ہیں)

لیکن اثبات و نفی، دونوں پہلو بحث طلب ہیں، بے شبہہ ۵ برس کا بچہ اگر یہ واقعہ بیان کرے کہ میں نے فلاں شخص کو دیکھا تھا، اس کے سر پر بال تھے، یا وہ بوڑھا تھا، یا اس نے مجھ کو گودیوں میں کھلایا تھا، تو اس روایت میں شبہہ کرنے کی وجہ نہیں، لیکن فرض کرو وہی بچہ یہ بیان کرتا ہے کہ فلاں شخص نے فقہ کا یہ دقیق مسئلہ بتایا تھا، تو شبہہ ہو گا کہ بچہ نے صحیح طور سے مسئلہ کو سمجھا بھی تھا یا نہیں؟

فقہا نے اس نکتہ کو ملحوظ رکھا ہے، فتح المغیث میں شرح مہذب سے نقل کیا ہے۔

قبول اخبار الصبى المميز فى طريقة المشاهدة بخلاف ما طريقة النقل كا لا فتاء ورواية الاخبار ونحوه (نسخه مطبوعه لکھنو ص ۱۳۲)

باتمیز لڑکے کی روایت ان واقعات کے متعلق جو دیکھنے سے تعلق رکھتے ہوں، لیکن جو باتیں نقلیات میں داخل ہیں، مثلاً فتویٰ یا حدیث کی روایت ان میں ان کی روایت مقبول نہیں۔

لیکن عام طور سے یہ اصول تسلیم نہیں کیا گیا، فتح المغیث میں ہے۔

ثم الضبط نوعان ظاهر وباطن فالظاهر ضبط معناه من حيث اللغة والباطن ضبط معناه من حيث تعلق الحكم الشرعى به وهو الفقه و مطلق الضبط الذى هو شرط فى فى الراوى هو الضبط ظاهرا عند الاكثر لانه يجوز نقل الخبر بالمعنى

پھر ضبط (۱) کی دو قسمیں ہیں، ظاہری اور باطنی، ظاہری کے یہ معنی ہیں کہ لفظ کے لغوی معنی کا لحاظ رکھا جائے، باطنی کے یہ معنی کہ شرعی حکم جس بنا پر متعلق ہے اس کا لحاظ رکھا جائے اس کو فقہ کہتے ہیں، لیکن مطلقاً جو ضبط راوی کے لئے مشروط ہے، اکثروں کے نزدیک وہ صرف ظاہری ضبط ہے، کیونکہ ان

(۱) ضبط کا لفظ محدثین کی ایک اصطلاح ہے جس کے معنی کسی روایت کے الفاظ اور مطلب کو اچھی طرح سمجھنا اور ادا کرنا۔

فيلحقه تهمة تبديل المعنى بروايته قبل الحفظ او قبل العلم حين سمع ولهذا المعنى قلت الرواية عن اكثر الصحابة لتعذر هذا المعنى قال و هذا الشرط وان كان على ما بينا فان اصحاب الحديث قل ما يعتبرونه فى حق الطفل دون المغفل فانه متى صح عند هم سماع الطفل او حضوره اجازوا روايته - (ص ۱۲)

لوگوں کے نزدیک روایت بالمعنی جائز ہے۔ اسی بنا پر سنتے وقت قلت حفظ، یا قلت علم کے سبب سے روایت کے ادا کرنے میں راوی پر مفہوم کے بدل دینے کا شبہہ ہو سکتا ہے، یہ وجہ ہے کہ اکثر صحابہؓ نے بہت کم حدیثیں روایت کیں۔ کیونکہ مفہوم کا بعینہ روایت میں قائم رکھنا مشکل ہے، لیکن محدثین بچہ کے حق میں (بے عقل کے حق میں نہیں) اس کا اعتبار نہیں کرتے۔ بلکہ بچہ ان کے نزدیک جب سننے اور مجلس میں شریک ہونے کے قابل ہو گیا۔ تو اس کی روایت کو جائز سمجھتے ہیں۔

راویوں میں فقاہت کی شرط

ایک یہ بحث ہے کہ جو صحابہؓ فقیہ نہ تھے، ان کی روایت اگر قیاس شرعی کے خلاف ہو، تو واجب العمل ہوگی یا نہیں؟ اس کے متعلق بحرالعلوم، امام فخرالاسلام کا مذہب نقل کر کے لکھتے ہیں:۔

ووجه قول الا مام فخر الاسلام ان النقل بالمعنى شائع و قلما يوجد النقل باللفظ فان حادثة واحدة قد رويت بعبارات مختلفة ثم ان تلك العبارات ليست مترادفة بل قدروى ذلك المعنى بعبارات مجازية فاذا كان الراوى غير فقيه احتمل الخطاء فى فهم المعنى المرادى الشرعى **** ولا يلزم منه نسبة الكذب متعمدا الى الصحابى معاذالله عن ذالك

(شرح مسلم مطبوعہ لکھنو ص ۴۳۲)

امام فخرالاسلام کے قول کی وجہ یہ ہے کہ روایت بالمعنی عام طور پر شائع ہے، اور ایسا بہت کم ہوتا ہے، کہ روایت باللفظ کی جائے کیونکہ ایک ہی واقعہ مختلف الفاظ میں ادا کیا گیا ہے اور یہ الفاظ باہم مرادف بھی نہیں۔ بلکہ اکثر مجازی عبارتوں میں مطالب ادا کئے گئے ہیں اس بنا پر جب راوی فقیہ نہ ہوگا، تو احتمال ہوگا، کہ اس نے مطلب مقصود شرعی کے سمجھنے میں غلطی کی ہو، اس سے معاذاللہ یہ لازم نہیں آتا کہ صحابی کی طرف جھوٹ کی نسبت کی جائے۔

محدثین اس اصول سے کہ واقعہ جس درجہ کا اہم ہو۔ شہادت بھی اسی درجہ کی اہم ہونی چاہئیے بے خبر نہ تھے، امام بیہقی کتاب المدخل میں ابن مہدی کا قول نقل کرتے ہیں۔

اذا روينا عن النبى (صلى الله عليه وسلم)

جب ہم آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم)

فی الحلال و الحرام والاحکام شددنا فی الاسانید وانتقدنا فی الرجال و اذا روینا فی الفضائل والثواب والعقاب سهلنا فی الاسانید و تسامحنا فی الرجال (فتح المغیث ص ۱۲۰)

سے حلال وحرام اور احکام کے متعلق حدیث روایت کرتے ہیں، تو سند میں نہایت تشدد کرتے ہیں اور راویوں کو پرکھ لیتے ہیں، لیکن جب فضائل اور ثواب وعقاب کی حدیثیں آتی ہیں تو ہم سندوں میں سہل انکاری کرتے، اور راویوں کے متعلق چشم پوشی کرتے ہیں۔

امام احمدؒ بن حنبل کا قول ہے۔

ابن اسحاق رجل تکتب عنه هذه الاحادیث یعنی المغازی ونحوها اذا جاء الحلال و الحرام اردنا قوما هکذا و قبض اصابع یدیه الا ربع (فتح المغیث ص ۱۲۰)

ابن اسحاق اس درجہ کے آدمی ہیں کہ مغازی وغیرہ کی حدیثیں ان سے روایت کی جاسکتی ہیں، لیکن جب حلال وحرام کے مسائل آئیں تو ہم کو ایسے لوگ درکار ہیں، یہ کہہ کر انھوں نے چار انگلیاں بند کر کے دبالیں۔

اس سے ثابت ہوا کہ محدثین واقعہ کی اہمیت کی بنا پر راوی کے درجہ کا لحاظ رکھتے تھے، اسی بنا پر ابن اسحاق کی نسبت امام ابن حنبل نے یہ تفریق کی کہ حلال وحرام میں ان کی شہادت معتبر نہیں، لیکن مغازی میں ان کا اعتبار ہے، یہ وہی اصول ہے، کہ جس درجہ کا واقعہ ہو اسی درجہ کی شہادت ہونی چاہئیے، اور یہ کہ واقعہ کے بدلنے سے شہادت کی اہمیت بدل جاتی ہے، لیکن واقعہ کی اہمیت احکام فقہیہ کے ساتھ مخصوص نہیں۔

نوعیت واقعہ کی اہمیت کا خیال فقہائے حنفیہ نے ملحوظ رکھا، اسی بنا پر ان کا مذہب ہے، کہ جو روایت قیاس کے خلاف ہو اس کی نسبت یہ دیکھنا چاہئیے کہ راوی فقیہ اور مجتہد بھی ہے یا نہیں؛ منار میں ہے۔

والراوی ان عرف بالفقه و التقدم فی الاجتهاد کالخلفاء الراشدین و العبادلة کان حدیثه حجة یترک به القیاس خلافا لمالک وان عرف بالعدالة والضبط دون الفقه کانس وابی هر... ة ان وافق حدیثه القیاس

راوی اگر تفقہ واجتہاد میں مشہور ہے جیسے کہ خلفائے راشدینؓ یا عبادلہؓ تھے، تو اس کی حدیث حجت ہوگی، اور اس کے مقابلہ میں قیاس چھوڑ دیا جائیگا، (بخلاف امام مالک کے) اور اگر راوی ثقہ اور عادل ہے لیکن فقیہ نہیں جیسے کہ حضرت انسؓ اور حضرت ابوہریرہؓ ہیں،

عمل به و ان خالفه لم یترک الا بالضرورة

تو اگر وہ روایت قیاس کے موافق ہوگی تو اس پر عمل ہوگا، ورنہ قیاس کو بغیر ضرورت ترک نہ کیا جائے گا۔ (نور الانوار ص ۱۷۶، ۱۷۷)

حضرت ابوہریرۃؓ کی مثال اگرچہ قابل بحث ہے، کیونکہ اکثر علما کے نزدیک حضرت ابوہریرۃؓ فقیہ اور مجتہد تھے، لیکن یہ جزوی بحث ہے، گفتگو اصل مسئلہ میں ہے۔

روایت میں قیاس کا کس قدر حصہ شامل ہے

۷۔ سب سے اہم اور سب سے زیادہ قابل بحث بات یہ ہے کہ راوی جو واقعہ بیان کرتا ہے، اس میں کس قدر حصہ اصل واقعہ ہے، اور کس قدر راوی کا قیاس ہے، تفحص اور استقراء سے بعض جگہ یہ نظر آتا ہے کہ راوی جس چیز کو واقعہ کی حیثیت سے بیان کرتا ہے، وہ اس کا قیاس ہے، واقعہ نہیں، اس کی بہت سی مثالیں سیرت میں موجود ہیں، یہاں ہم صرف ایک دو واقعہ پر اکتفا کرتے ہیں۔

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) جب ازواج مطہراتؓ سے ناراض ہو کر تنہا نشین ہوگئے تھے، تو یہ مشہور ہوا کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ازواج کو طلاق دیدی، حضرت عمرؓ نے یہ خبر سنی تو مسجد نبویؐ میں آئے، یہاں لوگ کہہ رہے تھے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ازواج کو طلاق دیدی، حضرت عمرؓ نے خود رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہو کر دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ نہیں میں نے طلاق نہیں دی۔

یہ حدیث بخاری میں کئی جگہ بہ اختلاف الفاظ مذکور ہے کتاب النکاح میں جو روایت ہے اس کی شرح میں حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:۔

وان الاخبار التی تشاع ولو کثر ناقلوھا ان لم یکن مرجعھا الی امر حسی من مشاھدۃ اوسماع لا تستلزم الصدق فان جزم الانصاری فی روایتہ بوقوع التطلیق وکذا جزم الناس الذی راٰھم عمر عند المنبر بذالک محمول علی انہ شاع بینھم ذالک من شخص بناہ علی التوھم الذی توھمہ من اعتزال النبی نسائہ فظن لکونہ لم تجر عادتہ

جو خبریں شائع ہو جاتی ہیں گو ان کے راوی کثرت سے ہوں، لیکن اگر ان خبروں کی بنیاد امر حسی یعنی مشاہدہ یا استماع نہ ہو تو ان کا سچا ہونا ضروری نہیں چنانچہ انصاری نے اور ان صحابہ نے جن کو حضرت عمرؓ نے منبر کے پاس دیکھا تھا، طلاق کا جو یقین کر لیا وہ یوں ہوا ہو گا کہ کسی شخص نے آنحضرتؐ کو دیکھا کہ آپ نے ازواج مطہرات سے علحدگی اختیار کرلی ہے، اور چونکہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی یہ عادت نہ تھی، اس لئے اس نے یہ

بذالک انّہ طلقھن فاشاع انّہ طلقھنّ فشاعَ ذلک فتحدث الناس بہ و اخلق بھذا الذی ابتداء باشاعۃ ذالکّ ان یکون من المنا فقین کما تقدّم (فتح الباری شرح بخاری طبع اول مصر جلد ۹ ص ۲۵۷)

قیاس کیا کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے طلاق دیدی۔ اس نے یہ خبر پھیلا دی اور ایک دوسرے سے اس کو بیان کرنے لگے۔ اور قیاس یہ ہے کہ اول جس شخص نے یہ خبر پھیلائی وہ منافق ہو گا۔

غور کرو، مسجد نبویؐ میں تمام صحابہؓ جمع ہیں، اور سب بیان کر رہے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے طلاق دیدی، صحابہؓ عموماً ثقہ اور عادل ہیں، اور ان کی تعداد کثیر اس واقعہ کو بیان کر رہی ہے، باوجود اس کے جب تحقیق کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے، کہ وہ واقعہ نہیں بلکہ قیاس تھا، حافظ ابن حجر نے بڑی جرات کر کے یہ خیال ظاہر کیا کہ راوی اوّل منافقین میں سے ہو گا، حضرت عائشہؓ صدیقہ کی نسبت بہت سے ایسے واقعات روایتوں میں مذکور ہیں، جن میں سے ایک واقعہ افک ہے، ان کی نسبت بھی وہی قیاس ہونا چاہیئے جو حافظ ابن حجر نے یہاں ظاہر کیا، یعنی یہ کہ منافقین نے ان کی طرف منسوب کر دیئے ہوں گے، پھر تمام مسلمانوں میں پھیل گئے۔

فن تاریخ و روایت پر خارجی اسباب کا اثر

۸۔ فن تاریخ و روایت پر جو خارجی اسباب اثر کرتے ہیں، ان میں سب سے بڑا قوی اثر حکومت کا ہوتا ہے، لیکن مسلمانوں کو ہمیشہ اس پر فخر کا موقع حاصل رہے گا کہ ان کا قلم تلوار سے نہیں دبا، حدیثوں کی تدوین بنوامیہ کے زمانہ میں ہوئی، جنھوں نے پورے ۹۰ برس تک سندھ سے ایشیاے کوچک اور اندلس تک مساجد جامع میں آلِ فاطمہ کی توہین کی، اور جمعہ میں سرِ منبر حضرت علیؓ پر لعن کہلوایا سیکڑوں ہزاروں حدیثیں امیر معاویہؓ وغیرہ کے فضائل میں بنوائیں۔ عباسیوں کے زمانہ میں ایک ایک خلیفہ کے نام بنام پیشین گوئیاں حدیثوں میں داخل ہوئیں، لیکن نتیجہ کیا ہوا، عین اسی زمانہ میں محدثین نے علانیہ منادی کردی، کہ یہ سب جھوٹی روایتیں ہیں، آج حدیث کا فن اس خس و خاشاک سے پاک ہے، اور بنوامیہ اور عباسیہ جو ظل اللہ اور جانشین پیغمبر تھے، اسی مقام پر نظر آتے ہیں، جہاں ان کو ہونا چاہیئے تھا۔

ایک دفعہ ایک شاعر نے مامون الرشید کے دربار میں قصیدہ پڑھا کہ "امیر المومنین! اگر تو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے انتقال کے وقت موجود ہوتا، تو خلافت کا جھگڑا سرے سے نہ پیدا ہوتا، دونوں فریق تیرے ہاتھ پر بیعت کرلیتے" وہیں سرِ دربار ایک شخص نے اٹھ کر کہا تو جھوٹ کہتا ہے، امیر المومنین کا باپ (حضرت عباسؓ جو عباسیوں کے مورث اعلیٰ ہیں) وہاں موجود تھا، اس کو کس نے پوچھا، ؟ مامون الرشید کو بھی

اس گستاخانہ لیکن سچ جواب کی تحسین کرنی پڑی۔

تاہم یہ عالمگیر موثر بالکل بے اثر نہیں رہ سکتا تھا، اس لئے مغازی میں اس کے نشانات پائے جاتے ہیں، تاریخ نگاری کا قدیم طریقہ یہ تھا کہ فتوحات اور رزمیہ کارناموں کو نہایت تفصیل سے لکھتے تھے، ملکی نظم و نسق اور تمدن و معاشرت کے واقعات یا تو بالکل قلم انداز کر جاتے تھے، یا اس طرح پراگندہ اور بے اثر لکھتے تھے کہ ان پر نگاہ نہیں پڑتی تھی، اسلام میں جب تالیف و تصنیف کی ابتداء ہوئی تو یہی نمونے پیش نظر تھے، اس کا پہلا نتیجہ یہ تھا کہ سیرت کا نام مغازی رکھا گیا، جس طرح سلاطین کی تاریخیں جنگ نامہ و شاہنامہ کے نام سے لکھی جاتی ہیں، چنانچہ سیرت کی ابتدائی تصنیف مثلاً سیرت موسیٰ بن عقبہ اور سیرت ابن اسحاق مغازی ہی کے نام سے مشہور ہیں ان کتابوں کی ترتیب یہ ہے کہ سلاطین کی تاریخ کی طرح سنین کو عنوان بناتے ہیں، اور اسی ترتیب سے حالات لکھتے ہیں، یہ حالات تمام تر جنگی معرکے ہوتے ہیں، اور غزوات ہی کے عنوان سے داستانیں شروع کی جاتی ہیں۔

یہ طریقہ اگرچہ سلطنت و حکومت کی تاریخ کے لئے بھی صحیح نہیں تھا، لیکن نبوت کی سوانح نگاری کے لئے تو ناموزوں ہے، پیغمبر کو ناگزیر طور پر جنگی واقعات پیش آتے ہیں اس خاص حالت میں وہ بظاہر ایک فاتح یا سپہ سالار کے رنگ میں نظر آتا ہے لیکن یہ پیغمبر کی اصلی صورت نہیں ہے، پیغمبر کی زندگی کا ایک ایک خط و خال، تقدس، نزاہت، حلم و کرم، ہمدردی عام اور ایثار ہوتا ہے، بلکہ عین اس وقت جب کہ اس پر سکندر اعظم کا دھوکا ہوتا ہے، ژرف بیں نگاہ فوراً پہچان لیتی ہے کہ سکندر نہیں بلکہ فرشتۂ یزدانی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مغازی کا انداز حدیث کی کتابوں میں سیرت کی تصنیفات سے بالکل الگ ہے۔

تمام ارباب سیر لکھتے ہیں کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جب بنو نضیر کا محاصرہ کیا تو حکم دیا کہ ان کے نخلستان کاٹ ڈالے جائیں (قرآن مجید میں بھی اس کا اجمالی ذکر ہے) ارباب سیر یہ بھی لکھتے ہیں کہ یہودیوں نے اس حکم کی نسبت یہ اعتراض کیا کہ "یہ انصاف اور انسانیت کے خلاف ہے"۔ لیکن مورخین یہ اعتراض نقل کرکے اس کا جواب نہیں دیتے، اور یونہی گذر جاتے ہیں:۔

قیاس و درایت ۹۔ نہایت مہتم بالشان بحث یہ ہے کہ کوئی روایت اگر عقل، یا مسلمات، یا دیگر قرائن صحیحہ کے خلاف ہو تو آیا صرف اس بنا پر واجب التسلیم ہوگی یا نہیں کہ رواۃ ثقہ ہیں اور سلسلۂ سند متصل ہے؟ علامہ ابن جوزی نے اگرچہ لکھا ہے (جیسا کہ اوپر گذر چکا) کہ جو حدیث عقل کے خلاف ہو، اس کے رواۃ کی جرح و تعدیل کی ضرورت نہیں، لیکن اس سے اصل بحث کا فیصلہ نہیں ہوتا، عقل کا لفظ ایک غیر مشخص لفظ ہے حامیانِ روایت لکھتے

ہیں کہ اگر اس لفظ کو وسعت دے دی گئی تو ہر شخص جس روایت سے چاہے گا، انکار کر دے گا کہ یہ میرے نزدیک عقل کے خلاف ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس بحث کا قطعی فیصلہ کرنا مشکل ہے، عام خیال یہ ہے کہ جس روایت کے رواۃ ثقہ اور مستند ہوں اور سلسلۂ روایت کہیں سے منقطع نہ ہو، وہ باوجود خلافِ عقل ہونے کے انکار کے قابل نہیں، ذیل کی مثالوں سے اس کا اندازہ ہو گا۔

(۱) تِلْکَ الْغَرَانِیْقُ الْعُلٰی ، کی حدیث کو جس میں بیان ہے کہ شیطان نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زبان مبارک سے وہ الفاظ نکلوا دیئے جن میں بتوں کی تعریف ہے، بعض محدثین نے ضعیف اور ناقابلِ اعتبار کہا تھا، اس کے باطل ہونے کی ایک عقلی دلیل یہ بیان کی تھی۔

لو وقع لارتد کثیر ممّن اسلم ولم ینقل ذالک ۔

اگر ایسا ہوتا تو بہت سے مسلمان اسلام سے پھر جاتے حالانکہ ایسا ہونا مذکور نہیں۔

حافظ ابن حجر، فتح الباری میں اس قول کو نقل کر کے لکھتے ہیں ۔

وجمیع ذالک لا یتمشّی علی القواعد فان الطرق اذا کثرت وتباینت مخارجها دلّ ذلک علی انّ لها اصلا (۱)

یہ تمام اعتراضات اصول کے موافق چل نہیں سکتے۔ اس لئے کہ روایت کے طریقے جب متعدد ہوتے ہیں اور ان کے مآخذ مختلف ہوتے ہیں تو یہ اس بات کی دلیل ہوتی ہے کہ روایت کی کچھ اصل ہے۔

(۲) صحیح بخاری میں لکھا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تین دفعہ جھوٹ بولے تھے، امام رازی نے اس حدیث سے اس بنا پر انکار کیا کہ "اس سے حضرت ابراہیمؑ کا جھوٹ بولنا لازم آتا ہے" اس لئے زیادہ آسان صورت یہ ہے کہ ہم حدیث کے کسی راوی کا جھوٹا ہونا مان لیں، علامہ قسطلانی امام رازی کا یہ قول نقل کر کے لکھتے ہیں۔

فلیس بشیء اذ الحدیث صحیح ثابت ولیس فیه نسبة محض الکذب الی الخلیل وکیف السبیل الی تخطیة الرّاوی مع قوله انی سقیم وبل فعله کبیرهم هذا وعن سارة اختی اذظاهر هذه الثلاثة بلا ریب غیر مراد (۲)

امام رازی کا قول بالکل ہیچ ہے اس لئے کہ حدیث ثابت ہے۔ اور اس میں محض کذب کی نسبت حضرت خلیلؑ کی طرف نہیں ہے۔ اور راوی کا تخطیہ کیونکر ہو سکتا ہے جب کہ حضرت ابراہیمؑ کا یہ قول موجود ہے انی سقیم اور بل فعله کبیرهم هذا اور سارة اختی کیونکہ ان تینوں جملوں میں ظاہر لفظ قطعا مراد نہیں۔

(۱) فتح الباری جلد ۸ صفحہ ۳۳۳ مطبوعہ مصر (۲) قسطلانی جلد ۵ ص ۳۸۹

اس قسم کی بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں ہم نے اختصار کے لحاظ سے صرف دو مثالیں نقل کیں۔

صحابہ میں دو گروہ

ان کے مقابلہ میں ایک دوسرا گروہ ہے جو دلائل عقلی اور قرائن حالی کی بنا پر بعض حدیث کے تسلیم کرنے میں تامل کرتا ہے، اور یہ طریقہ خود صحابہ کرامؓ کے عہد میں شروع ہو گیا تھا، اور محدثین کے اخیر دور تک قائم رہا، چونکہ یہ رائے عام خیال کے خلاف ہے، اس لئے ہم اس کی متعدد مثالیں نقل کرتے ہیں۔

(۱) حضرت ابوہریرہؓ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے حدیث بیان کی کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا ہے کہ "جس چیز کو آگ چھوئے اس کے کھانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے"۔ حضرت ابن عباسؓ نے کہا "اس کی بنا پر تو لازم آتا ہے کہ ہم گرم پانی سے بھی وضو نہ کریں"۔ حضرت ابوہریرہؓ نے کہا "بھتیجے جب آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی کوئی حدیث سنو تو کہاوتیں نہ کہا کرو" (۱)۔

(۲) صحیح مسلم کے مقدمہ میں ہے کہ ایک دفعہ حضرت ابن عباسؓ کے سامنے حضرت علیؓ کے قضایا (یعنی مقدمات کے فیصلے) پیش کئے گئے۔ حضرت ابن عباسؓ اس کی نقل لیتے جاتے تھے، اور بعض بعض فیصلے چھوڑتے جاتے تھے اور فرماتے تھے کہ

واللہ ما قضی بھذا علیؓ الاّ ان یکون ضلّ	خدا کی قسم علی نے یہ فیصلہ کیا ہے تو گمراہ ہو گیا ہے (لیکن چونکہ وہ گمراہ نہ تھے اس لئے یہ فیصلہ بھی نہ کیا ہو گا)۔

اسی روایت کے بعد صحیح مسلم میں یہ روایت ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کے پاس لوگ ایک کتاب لائے، جس میں حضرت علیؓ کے فیصلے قلمبند تھے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے ایک گز کے بقدر چھوڑ کر باقی کتاب مٹادی (۲)۔ اس سے ظاہر ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے صرف ان فیصلوں کے مضمون سے یہ قیاس کر لیا کہ وہ صحیح نہیں ہو سکتے، اس بات کی ضرورت نہیں سمجھی کہ رواۃ اور سند کا پتہ لگائیں۔

(۳) صحیح بخاری (باب صلوۃ النوافل جماعۃ) میں ہے کہ محمود بن ربیع نے ایک جلسہ میں یہ حدیث بیان کی کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا ہے کہ "جو شخص خالصاً خدا کے لئے لاالہ الاّاللہ کہے گا۔ خدا اس پر آگ حرام کر دے گا"۔ اس جلسہ میں حضرت ابوایوب انصاریؓ بھی موجود تھے، جن کے مکان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ تک قیام فرمایا تھا۔ حضرت ابوایوب انصاریؓ نے یہ حدیث سن کر کہا:

---

(۱) ابن ماجہ و ترمذی حدیث الوضوء مما مست النار (۲) نووی نے شرح صحیح مسلم میں لکھا ہے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کتاب ملاطفہ کی شکل میں لکھی تھی (جس طرح اگلے زمانہ میں خطوط کو لمبان میں جوڑ کر جمع کرتے تھے، اور لپیٹ کر رکھتے تھے)۔

والله ما اظنّ رسول الله (صلی الله علیه وسلم) قال ما قلت قطّ — خدا کی قسم میں کبھی یہ خیال نہیں کر سکتا کہ جو تم کہتے ہو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہوگا

محمود بن الربیعؓ صحابی تھے اور حضرت ابو ایوبؓ کو ان کے ثقہ ہونے میں کلام نہ تھا تاہم چونکہ یہ حدیث ان کے نزدیک قرآن کے خلاف تھی حضرت ابو ایوبؓ اس پر یقین نہ لاسکے، اور کہا کہ "آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایسا نہ فرمایا ہوگا"۔ اگرچہ صحیح بخاری میں ہے کہ محمود بن الربیعؓ نے مدینہ آکر اس حدیث کی تصدیق اپنے راوی (عتبان) سے کرلی، لیکن اس سے اصل مسئلہ پر اثر نہیں پڑتا، حضرت ابو ایوبؓ کو جن اسباب کی بنا پر محمود بن الربیعؓ کی روایت میں شبہہ پیدا ہوا، عتبان پر بھی وہی شبہہ پیدا ہو سکتا تھا، حضرت ابو ایوبؓ خدا نخواستہ محمود کو غلط گو نہیں سمجھتے تھے، بلکہ سمجھتے تھے کہ انہوں نے روایت کے مفہوم سمجھنے میں غلطی کی ہوگی، یہ احتمال بعینہ راوی اول کی نسبت بھی ہو سکتا ہے، جیسا کہ حضرت عائشہؓ نے بعض صحابہؓ سے کہا تھا کہ تم لوگ سچے لوگوں سے روایت کرتے ہو لیکن سامعہ غلطی کر جاتا ہے (۱)۔

(۴) حضرت عمار بن یاسرؓ نے حضرت عمرؓ کے سامنے تیمم کی روایت بیان کی تو حضرت عمرؓ کو یقین نہیں آیا، بلکہ جیسا کہ صحیح مسلم باب التیمم میں ہے، یہ الفاظ کہے اتق اللہ یا عمار یعنی اے عمار! خدا سے ڈرو، چنانچہ اسی بنا حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے سامنے حضرت ابو موسیٰؓ نے اس روایت سے استدلال کیا تو حضرت عبداللہؓ نے کہا ہاں، لیکن عمرؓ کو عمارؓ کی روایت سے تسکین نہیں ہوئی (۲)۔

(۵) حضرت عائشہؓ کے سامنے جب یہ حدیث بیان کی گئی کہ لوگوں کے نوحہ کرنے سے مردہ پر عذاب ہوتا ہے تو انہوں نے اس بنا پر انکار کیا کہ یہ قرآن مجید کی اس آیت کے خلاف ہے۔

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی — اور کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔
(بنی اسرائیل، ۱۷:۱۵)

(۶) اسی طرح جب ان کے سامنے یہ حدیث بیان کی گئی کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کشتگان بدر کی نسبت فرمایا کہ میں جو کہتا ہوں یہ سنتے ہیں، حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ ابن عمرؓ نے غلطی کی (۳)، اس روایت کے راوی، اگرچہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ تھے، جو مشہور صحابی ہیں، لیکن حضرت عائشہؓ نے اس بنا پر روایت کی صحت سے انکار کیا کہ ان کے نزدیک وہ روایت قرآن مجید کے خلاف تھی۔

---

(۱) صحیح مسلم کتاب الجنائز" س" (۲) صحیح مسلم باب التیمم و صحیح بخاری، کتاب التیمم۔ (۳) صحیح مسلم کتاب الجنائز میں یہ روایتیں متعدد طریقوں سے مذکور ہیں۔

اکثر محدثین نے ان مباحث میں ثابت کیا ہے کہ روایت صحیح ہے اور حضرت عائشہؓ کا اجتہاد جس بنا پر انہوں نے روایت سے انکار کیا صحیح نہیں، ہم کو اس سے بحث نہیں، اس موقع پر صرف یہ بحث ہے کہ اکابر صحابہ میں ایسے لوگ بھی تھے جو روایت کو باوجود راوی کے ثقہ ہونے کے اس بنا پر تسلیم نہیں کرتے تھے کہ وہ دلائل عقلی یا نقلی کے خلاف ہے۔

(۷) ایک مختلف فیہ مسئلہ یہ ہے کہ عورت کو جب طلاق دیدی جائے تو عدت کے زمانہ تک شوہر پر اس کے کھانے پینے اور رہنے کا انتظام واجب ہے یا نہیں، فاطمہؓ بنت قیس ایک صحابیہ تھیں جن کو ان کے شوہر نے طلاق دیدی تھی، ان کا بیان ہے کہ وہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس گئیں تو آپؐ نے ان کو نفقہ اور مکان نہیں دلوایا، انہوں نے یہ حدیث حضرت عمرؓ کے سامنے بیان کی، حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ہم خدا کی کتاب اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سنت کو ایک عورت کے بیان پر چھوڑ نہیں سکتے، جس کی نسبت ہم کو معلوم نہیں کہ اس نے یاد رکھا یا بھول گئی، امام شعبی نے ایک مجلس میں فاطمہؓ کی یہ روایت بیان کی تو اسود بن یزید نے ان کو کنکریاں ماریں کہ تم ایسی حدیث بیان کرتے ہو، پھر حضرت عمرؓ کا مذکورہ بالا واقعہ نقل کیا (۱)۔

محدثین اور درایت حدیث

صحابہ کے بعد بھی محدثین میں ایک ایسا گروہ موجود رہا جو عقلی یا نقلی وجوہ کی بنا پر بعض روایات کے تسلیم کرنے میں تامل کرتا تھا، گو ان کے رواۃ ثقہ اور مستند ہوتے تھے۔

(۱) ایک ضعیف حدیث ہے کہ "جس شخص نے عشق کیا اور پاک دامن رہا، اور وفات پائی، وہ شہید ہوا"۔ حافظ ابن القیم زاد المعاد میں اس حدیث کو دلائل عقلی سے باطل ثابت کر کے لکھتے ہیں:۔

فلو کان اسناد هذا الحدیث کالشمس کان غلطا و وهما (۲)	اگر اس حدیث کی سند آفتاب کی طرح بھی ہوتی، تب بھی وہ غلط اور وہم ہوتی۔

(۲) صحیح مسلم، کتاب الجہاد، باب الفئ میں روایت ہے کہ حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ حضرت عمرؓ کے پاس آئے، حضرت عباسؓ نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ

اقض بینی و بین هذا الکاذب الآثم الغادر الخائن	میرے اور اس جھوٹے مجرم، دھوکہ باز، خائن کے درمیان فیصلہ کیجئے۔

چونکہ حضرت علیؓ کی شان میں یہ الفاظ مسلمان کی زبان سے نہیں نکل سکتے، اس لئے بعض محدثین نے اپنے نسخہ سے یہ الفاظ نکال دیئے (۳)، علامہ مازری، اس حدیث کی نسبت لکھتے ہیں:

---

(۱) صحیح مسلم کتاب الطلاق (۲) زاد المعاد (جزء ثانی) مطبوعہ کانپور ص ۹۶ (۳) نودی شرح صحیح مسلم ذکر حدیث مذکور

اذا انسدّت طرق تاویلها نسبنا الکذب الی رواتها (۱)

جب اس حدیث کی تاویل کے سب رستے رک جائیں گے تو ہم راویوں کو جھوٹا کہیں گے۔

(۳) بخاری میں روایت ہے کہ خدا نے جب حضرت آدمؑ کو پیدا کیا تو ان کا قد ساٹھ گز کا تھا حافظ ابن حجر اس کی شرح میں لکھتے ہیں:۔

ویشکل علی هذا ما یوجد الآن من آثار الامم السالفة کدیار ثمود . فانّ مساکنهم تدلّ علی ان قاماتهم لم تکن مفرطة الطول علی حسبما یقتضیه الترتیب السابق...... ولم یظهر الآن ما یزیل هذا الاشکال (۲)

اور اس پر یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ قدیم قوموں کے جو آثار اس وقت موجود ہیں مثلاً قوم ثمود کے مکانات، ان سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کے قد اس قدر بڑے نہ تھے جیسا کہ ترتیب سابق سے ثابت ہوتا ہے۔ ....اور اس وقت تک مجھ کو اس اشکال کا جواب نہیں معلوم ہوا۔

(۴) صحیح بخاری میں روایت ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام خدا سے کہیں گے کہ اے خدا تو نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ قیامت میں مجھ کو رسوا نہ کرے گا، اس حدیث کی شرح میں حافظ ابن حجر لکھتے ہیں۔

وقد استشکل الاسماعیلی هذا الحدیث من اصله وطعن فی صحته (۳)

اور اسماعیلی نے اس حدیث پر اشکال وارد کیا ہے، اور اس کی صحت پر طعن کیا ہے۔

اسماعیلی کے اعتراض کا حافظ ابن حجر نے جواب دیا ہے، لیکن اسماعیلی کا درجہ فنِ حدیث میں حافظ ابن حجر سے زیادہ ہے اس لئے گو اسماعیلی کا اعتراض غلط ہو، لیکن قابل لحاظ ہو سکتا ہے، کہ ان کے نزدیک یہ حدیث استدلال کے خلاف ہے۔

(۵) عمرو بن میمون سے روایت ہے کہ میں نے زمانۂ جاہلیت میں ایک بندر کو دیکھا، جس نے زنا کیا تھا، اس پر بندروں نے جمع ہو کر اس کو سنگسار کیا، حافظ ابن عبدالبر نے جو مشہور محدث ہیں اس بنا پر اس حدیث کی صحت میں تامل کیا کہ جانور مکلف نہیں، اس لئے ان کے فعل پر نہ زنا کا اطلاق ہو سکتا ہے نہ اس بنا پر ان کو سزا دی جا سکتی، حافظ ابن حجر لکھتے ہیں۔

وقد استنکر ابن عبدالبر قصة عمرو بن میمون هذه وقال فیها اضافة الزنا الی غیر مکلف واقامة الحد علی البهائم (۴)

ابن عبدالبر نے عمرو بن میمون کے اس قصہ سے انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ اس میں غیر مکلف کی طرف زنا کی نسبت ہے اور جانوروں پر حد قائم کرنا بیان کیا گیا ہے۔

(۱) نووی شرح صحیح مسلم کتاب الجهاد باب الفئ (۲) فتح الباری مطبوعہ مصر جلد ۶ ص ۲۴۰ بدء الخلق (۳) فتح الباری مطبوعہ مصر جلد ۸ ص ۳۸۴ (۴) فتح الباری مطبوعہ مصر جلد ۷ ص ۱۲۲

حافظ ابن حجر نے یہ قول نقل کر کے لکھا ہے کہ "اعتراض کا یہ طریقہ پسندیدہ نہیں ہے، اگر سند صحیح ہے تو غالباً یہ بندر جن رہے ہوں گے"۔

(۶) صحیح بخاری میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ایک (۱) دفعہ عبداللہ بن ابی کے طرفداروں اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے صحابہ میں جھگڑا ہو گیا، اس پر یہ آیت اتری:۔

وَاِنْ طَآئِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا (حجرات ۹:۴۹)	اگر مسلمانوں کے دو ۲ گروہ آپس میں لڑ جائیں تو ان میں صلح کرا دو۔

روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت تک عبداللہ بن ابی اور اس کا گروہ ظاہر میں بھی اسلام نہیں لایا تھا، اس بنا پر ابن بطالؒ نے اس حدیث پر اعتراض کیا ہے کہ آیت قرآنی اس واقعہ کے متعلق نہیں ہو سکتی، اس لئے کہ آیت میں تصریح ہے کہ جب دونوں گروہ مومن ہوں، اور یہاں عبداللہ ابن ابی کا گروہ علانیہ کافر تھا۔

حافظ ابن حجر نے اس کا جواب دیا ہے کہ تغلیباً ایسا کہا گیا۔

اس قسم کے اور بہت سے واقعات ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ بہت سے محدثین سلسلۂ سند کے ساتھ یہ بھی دیکھتے تھے کہ دوسرے شواہد اور قرائن بھی اس کے موافق ہیں یا نہیں۔

روایت بالمعنیٰ (۱۰) ایک بڑا مرحلہ روایت بالمعنیٰ کا ہے، یعنی آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یا صحابہؓ نے جو الفاظ فرمائے تھے، بعینہ وہی ادا کرنے چاہئیں، یا ان کا مطلب ادا کر دینا کافی ہے، محدثین اس باب میں مختلف الرّائے ہیں، اور اکثروں نے یہ فیصلہ کیا کہ اگر راوی اپنے الفاظ میں اس طرح مطلب ادا کرتا ہے کہ اصل حقیقت میں فرق نہیں پیدا ہوتا، تو الفاظ کی پابندی ضرور نہیں، لیکن اس کا فیصلہ کرنا کہ اصل مطلب ادا ہوا یا بدل گیا، ایک اجتہادی بات ہے اسی بنا پر بعض محدثین مثلاً عبدالملک بن عمر، ابو زرعہ، سالم بن جعد، قتادہ، امام مالک، ایک ایک لفظ کی پابندی کرتے تھے (۲)، لیکن یہ ظاہر ہے کہ سیکڑوں راویوں میں صرف دو ۲ چار ۴ اشخاص ایسی پابندی کر سکتے تھے، اور وہ بھی اس زمانہ میں کہ تحریر کا رواج ہو چکا تھا، عام حالت یہی تھی کہ راوی حدیث کے مطلب کو اپنے الفاظ میں بیان کرتے تھے، جامع ترمذی، کتاب العلل میں سفیان ثوری کا قول نقل ہے۔

ان قلت لکم انی احدثکم کما سمعت اگر میں تم سے یہ کہوں کہ میں جو سنتا ہوں بعینہ

---

(۱) صحیح بخاری کتاب العلم۔ روایت میں جھگڑے کی تفصیل ہے، ہم نے محض خلاصہ ذکر کر دیا ہے۔ (۲) صحیح ترمذی کتاب العلل میں ان لوگوں کے متعلق یہ تصریح مذکور ہے۔

فلا تصدقونی، انما هو المعنی، وہی ادا کردیتا ہوں تو تم میری بات نہ مانو میں صرف مطلب ادا کرتا ہوں۔

ترمذی نے اسی مضمون کے اور اقوال واثلہ بن الاسقع، محمد بن سیرین، ابراہیم نخعی، حسن بصری، امام شعبی وغیرہ سے نقل کئے ہیں۔

جو صحابہؓ بہت محتاط تھے، حدیث کی روایت کے وقت ان کی حالت متغیر ہو جاتی تھی۔

سنن ابن ماجہ کے دیباچہ میں عمرو بن میمون کا قول نقل کیا ہے کہ میں عبداللہ ابن مسعودؓ کی خدمت میں ہمیشہ جمعرات کی رات کو حاضر ہوتا تھا، میں نے کبھی ان کو یہ کہتے نہیں سنا کہ "آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ فرمایا"۔ ایک دن ان کی زبان سے یہ لفظ نکل گیا تو دفعتہً سر جھکا لیا، پھر میری نظر ان پر پڑی تو دیکھا کہ کھڑے ہیں، قمیص کی گھنڈیاں کھلی ہیں، آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے ہیں، گلے کی رگیں پھول گئی ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یوں کہا یا یوں یا اس سے کچھ زیادہ یا اس سے کچھ کم، یا اس کے مشابہ۔

امام مالک کا یہ حال تھا کہ جب حدیث روایت کرتے تھے، تو خوف زدہ ہو جاتے، اور کہتے کہ "آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ فرمایا تھا، یا یوں فرمایا تھا" امام شعبی کہتے ہیں کہ "میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی خدمت میں سال بھر حاضر رہا، لیکن میں نے ان کو کبھی حدیث روایت کرتے نہیں دیکھا"۔ سائب بن یزید کہتے ہیں کہ "میں نے سعد بن مالکؓ کے ساتھ مکہ مبارکہ سے مدینہ طیبہ تک سفر کیا، لیکن اس تمام راہ میں انہوں نے ایک حدیث بھی آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے روایت نہیں کی" (حالانکہ وہ صحابی تھے) حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ نے اپنے والد سے پوچھا کہ "میں نے آپ کو اور صحابہؓ کی طرح حدیث روایت کرتے نہیں دیکھا"۔ انہوں نے کہا "میں جب سے اسلام لایا میں نے کبھی آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ساتھ نہیں چھوڑا، لیکن میں نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے سنا ہے کہ جو شخص میری نسبت کوئی جھوٹی روایت بیان کرے تو چاہیئے کہ اپنا گھر آگ میں بنائے" (۱)۔

ابن ماجہ نے روایت کی ہے کہ خود آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے منبر پر ارشاد فرمایا تھا:۔

ایّاکم و کثرۃ الحدیث عنّی (۲) خبردار! مجھ سے زیادہ حدیثیں نہ روایت کرو۔

اس موقع پر یہ امر خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ اس قسم کی حدیثوں کے قبول کرنے میں جو تامل کیا جاتا ہے اس کو راوی کے ثقہ اور غیر ثقہ ہونے سے تعلق نہیں، مستند اور ثقہ راویوں کی دروغ گوئی کا خیال نہیں ہو سکتا، لیکن ثقہ راوی سے بھی مطلب روایت کے سمجھنے یا ادا کرنے میں

---

(۱) یہ تمام اقوال صحیح ابن ماجہ دیباچہ کتاب میں مذکور ہیں، دیکھو ص ۴ و ۵۔ مطبوعہ اصح المطابع لکھنو (۲) ابن ماجہ ص ۵۔

غلطی کا ہو جانا ممکن ہے اور ثقات کی روایت سے جب کسی موقع پر انکار کیا جاتا ہے تو اسی بنا پر انکار کیا جاتا ہے، حضرت عائشہ صدیقہؓ کے سامنے جب حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی یہ روایت بیان کی گئی،

ان المیت لیعذب ببکاء الحی — مردوں پر نوحہ کیا جائے تو ان پر عذاب کیا جاتا ہے۔

تو حضرت عائشہؓ نے فرمایا:

انکم لتحدثون عن غیر کاذبین ولا مکذبین ولکن السمع یخطیء (۱) — تم لوگ نہ خود جھوٹے ہو، نہ تمہارے راوی جھوٹے ہیں، لیکن کان غلطی کر جاتا ہے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت عائشہؓ نے عبداللہ بن عمرؓ کے متعلق فرمایا:

اما انہ لم یکذب ولکنہ نسی او اخطاء (۲) — ہاں وہ جھوٹ نہیں بولے لیکن بھول گئے یا خطا کی۔

روایت احاد

(۱۱) ایک اور بحث روایت احاد کی ہے، روایت احاد وہ ہے جس کے سلسلۂ اسناد میں کہیں صرف ایک راوی پر مدار روایت ہو، یعنی کوئی دوسرا راوی اس کا موئد نہ ہو، اس قسم کی روایت کے تسلیم و انکار اور یقینی و ظنی ہونے کے متعلق اہل فن کا اختلاف ہے، معتزلہ روایات احاد کے تسلیم سے قطعاً منکر ہیں، لیکن یہ در حقیقت انکار بداہت ہے، ہم روزمرہ واقعات زندگی میں اس قسم کی روایات پر اکثر بلاحجت و اصرار فوراً یقین کر لیتے ہیں، ہم سے ایک شخص آکر کہتا ہے کہ "زید تم کو بلاتا ہے" اور ہم فوراً اٹھ کر چلے جاتے ہیں، یہ نہیں کہتے کہ یہ خبر احاد ہے اور ہم اسے تسلیم نہیں کرتے، معتزلہ کے مقابل میں اکثر محدثین اس کی صحت اور قطعیت کے قائل ہیں، لیکن یہ در حقیقت تفریط ہے، خود صحابہؓ کا طرز عمل اس کے خلاف ہے۔

ایک دفعہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ، حضرت عمرؓ کی خدمت میں گئے اور تین دفعہ اجازت طلبی کی، چونکہ حضرت عمرؓ کسی کام میں مشغول تھے، کچھ جواب نہ ملا، وہ واپس چلے گئے، حضرت عمرؓ نے کام سے فارغ ہو کر ان کو بلوا بھیجا، اور واپسی کا سبب پوچھا، انہوں نے کہا "میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے سنا ہے کہ تین دفعہ اجازت طلبی کے بعد جواب نہ ملے تو واپس جاؤ۔" حضرت عمرؓ نے کہا "اس روایت پر گواہ لاؤ، ورنہ میں تم کو سزا دوں گا۔" حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے اس پر شہادت پیش کی تو حضرت عمرؓ نے تسلیم کیا، حضرت عمرؓ خدانخواستہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو غلط گو نہیں جانتے تھے، لیکن چونکہ حضرت عمرؓ بارگاہ نبوت میں برسوں رہے تھے، اور انہوں نے یہ حدیث آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے نہیں سنی تھی، حالانکہ حدیث ایسے امر کے متعلق تھی جو عموماً پیش آتا ہے، اس لئے حضرت عمرؓ نے واقعہ کی اہمیت کے لحاظ سے صرف ایک شخص کی شہادت کافی نہیں سمجھی۔

حضرت ابو بکرؓ کے سامنے ایک عورت نے جو میت کی دادی ہوتی تھی، میراث کا

(۱) صحیح مسلم کتاب الجنائز (۲) مسلم کتاب الجنائز۔

دعویٰ لیہ حضرت ابو بکرؓ نے کہا "قرآن میں دادی کی میراث مذکور نہیں، اور نہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے اس باب میں کوئی روایت مجھ کو معلوم ہے۔" مغیرہ بن شعبہؓ نے شہادت دی کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) دادی کو چھٹا حصہ دلایا کرتے تھے، حضرت ابو بکرؓ نے ان کی تنہا شہادت ایسے واقعہ کے متعلق کافی نہیں سمجھی، اور جب ایک اور صحابی محمد بن مسلمہؓ نے شہادت دی، تب حضرت ابو بکرؓ نے اس عورت کو میراث دلائی۔

اسی طرح جنین کی دیت کے متعلق حضرت عمرؓ نے مغیرہؓ کی تنہا شہادت کافی نہیں سمجھی، اس قسم کی اور بیسیوں مثالیں ہیں۔

(اسی بنا پر روایت احاد کے متعلق فقہائے احناف کا اصول ایک حد تک صحیح ہے کہ یہ ظنی الثبوت ہیں، ان سے قطعیت نہیں ثابت ہوتی ہے، اصل یہ ہے کہ روایات احاد کی صحت اور عدم صحت یا ظن و قطعیت رواۃ کے ثقہ اور معتبر ہونے کے بعد خود اصل روایت کی اہمیت اور عدم اہمیت پر مبنی ہے، ایک شخص جب ہم سے کہتا ہے کہ "زید نے تم کو بلایا ہے۔" تو راوی کی ثقاہت و اعتبار کے مسلم ہونے کے بعد ہم کو کبھی اس واقعہ کی تسلیم سے انکار نہیں ہوتا، لیکن اگر یہی شخص یہ کہتا ہے کہ "تم کو بادشاہ نے آج دربار میں بلایا ہے۔" تو ہم اس واقعہ کی تسلیم میں پس و پیش کرتے ہیں، اور اس کے ثبوت کے لئے دوسروں کی شہادت تلاش کرتے ہیں۔

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق اگر کوئی تنہا راوی یہ بیان کرتا ہے کہ "آپؐ ایک بار سپید کرتہ پہن کر باہر تشریف لائے۔" تو ہم کو اس کی تسلیم میں عذر نہیں، لیکن وہی راوی اگر یہ کہتا ہے کہ "ایک بار آپؐ برہنہ تن باہر نکل آئے۔" (اس قسم کی ایک روایت ہے) تو قطعاً ہم تنہا شہادت اس کے ثبوت کے لئے کافی نہیں سمجھیں گے۔

نتائج مباحث مذکورہ

گذشتہ صفحات میں ہم نے روایت و حدیث کے متعلق صحابۂ کبارؓ کا جو طرز عمل پیش کیا ہے اور علمائے نقد و حدیث کے جن قواعد و اصول کی تفصیل کی ہے، ذیل میں بہ ترتیب نتائج کے طور پر ہم ان کا اعادہ کرتے ہیں۔

(۱) سب سے پہلے واقعہ کی تلاش قرآن مجید میں، پھر احادیث صحیحہ میں پھر عام احادیث میں کرنی چاہئیے، اگر نہ ملے تو روایات سیرت کی طرف توجہ کی جائے۔

(۲) کتب سیرت محتاج تنقیح ہیں اور ان کے روایات و اسناد کی تنقید لازم ہے۔

(۳) سیرت کی روایتیں بہ اعتبار پایۂ صحت، احادیث کی روایتوں سے فروتر ہیں، اس لئے بصورت اختلاف، احادیث کی روایات کو ہمیشہ ترجیح دی جائے گی۔

(۴) بصورتِ اختلافِ روایاتِ احادیث، رواۃ اربابِ فقہ و ہوش کی روایات کو دوسروں پر ترجیح ہوگی۔

(۵) سیرت کے واقعات میں سلسلۂ علت و معلول کی تلاش نہایت ضروری ہے۔

(۶) نوعیت واقعہ کے لحاظ سے شہادت کا معیار قائم کرنا چاہیئے۔

(۷) روایت میں اصل واقعہ کس قدر ہے؟ اور راوی کی ذاتی رائے و فہم کا کس قدر جزء شامل ہے۔

(۸) اسباب خارجی کا کس قدر اثر ہے؟

(۹) جو روایت عام وجوہ عقلی، مشاہدہ عام، اصولِ مسلمہ اور قرائن حال کے خلاف ہوگی، لائق حجت نہ ہوگی۔

(۱۰) اہم موضوع پر مختلف روایات کی تطبیق و جمع سے اس کی تسلی کر لینی چاہیئے کہ راوی سے ادائے مفہوم میں تو غلطی نہیں ہوئی ہے۔

(۱۱) روایات احاد کو موضوع کی اہمیت اور قرائنِ حال کی مطابقت کے لحاظ سے قبول کرنا چاہیئے۔

ان اصول کے تقرر و تفصیل کے بعد نظر آسکتا ہے کہ اسلامی فن روایت عقل و درایت کی نگاہ سے کس قدر بلند پایہ ہے؟ علمائے حدیث نے تصحیح روایت کے لئے کتنی محنت و جانفشانی، کتنی دیدہ ریزی اور کتنی دقت رسی صرف کی ہے، کیا اس اہتمام و اعتنا کا دنیا کی دیگر قوموں کے سرمایۂ تاریخ و روایت میں ایک ذرہ نشان بھی موجود ہے؟ کیا یورپ کے سیرت نگاران پیغمبر اسلامؑ میں سے کسی نے بھی اس جانکاہی اور نکتہ سنجی کے ساتھ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی لائف کے لئے قلم اٹھایا ہے؟ اور کیا ایک غیر مسلم ان قواعد و اصول کی مراعات کے ساتھ قلم اٹھا بھی سکتا ہے؟ (۱)

---

(۱) زیادت، از صفحہ ۵۴ تا ۵۵ "س"۔

یورپین تصنیفات

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سیرت مبارک پر جو یورپین تصنیفات ہیں، ان پر پوری بحث تو کسی اور حصہ میں آئے گی جس میں نہایت تفصیل سے بتایا جائے گا کہ یورپ میں اسلام کے متعلق سب سے پہلے یورپین مصنف بلدی برٹ سے لے کر جو ۱۱۳۹ء میں موجود تھا۔ آج تک کیا سرمایہ مہیا ہوا ہے؟ ان کا کیا عام انداز ہے؟ ان کی مشترک اور عامۃ الورود غلطیاں کیا ہیں؟ ان کے وسائل معلومات کس درجہ کے ہیں؟ اغلاط کے مشترک اسباب کیا ہیں؟ تعصب اور سوءِ ظن کا جا بجا کہاں اثر ہے؟ یہاں ہم ان تصنیفات پر صرف ایک اجمالی گفتگو کرتے ہیں۔ کیونکہ اس حصہ میں بھی ہم کو ان تصنیفات سے کام لینا، یا ان سے تعرض کرنا پڑا ہے۔

یورپ کی پیغمبر اسلام سے ابتدائی واقفیت

یورپ ایک مدت تک اسلام کے متعلق مطلق کچھ نہیں جانتا تھا۔ جب اس نے جاننا چاہا تو مدت دراز تک عجب حیرت انگیز مفتریانہ خیالات اور توہمات میں مبتلا رہا۔ ایک یورپین مصنف لکھتا ہے:۔

"عیسائیت، اسلام کی چند ابتدائی صدیوں تک اسلام پر نہ تو نکتہ چینی کر سکی اور نہ سمجھ سکی۔ وہ صرف تھراتی اور حکم بجا لاتی تھی۔ لیکن جب قلب فرانس میں عرب پہلے پہل روکے گئے تو ان قوموں نے جو ان کے سامنے سے بھاگ رہی تھیں منھ پھیر کر دیکھا جس طرح کہ مویشیوں کا گلہ جب کہ اس کا بھگا دینے والا کتا دور نکل جاتا ہے"۔ (۱)

یورپ نے مسلمانوں کو جس طرح جانا، اس کو فرانس کا مشہور مصنف ہنری دی کاستری جس کی تصنیف کا عربی زبان میں ترجمہ ہو گیا ہے، یوں بیان کرتا ہے:۔

"وہ تمام قصص اور گیت جو اسلام کے متعلق یورپ میں قرونِ وسطیٰ سے رائج تھے، ہم نہیں سمجھتے کہ مسلمان ان کو سن کر کیا کہیں گے؟ یہ تمام داستانیں اور نظمیں، مسلمانوں کے مذہب

(۱) محمد اینڈ محمڈنزم از باسورتھ اسمتھ صاحب (ایم اے ص ۶۳) B.Smith: Mohammad & Mohammadanism P 63

کی ناواقفیت کی وجہ سے بغض وعداوت سے بھری ہوئی ہیں،
جو غلطیاں اور بدگمانیاں اسلام کے متعلق آج تک قائم ہیں۔ ان
کا باعث وہی قدیم معلومات ہیں۔ ہر مسیحی شاعر، مسلمانوں کو
مشرک اور بت پرست سمجھتا تھا۔ اور حسب ترتیب درجات
ان کے تین خدا تسلیم کئے جاتے تھے۔ ماہوم یا ماہون یا مافومیڈ
(یعنی محمدؐ) اور اپلین اور تیسرا ٹرگامان۔ ان کا خیال تھا کہ محمدؐ
نے اپنے مذہب کی بنیاد دعوائے الوہیت پر قائم کی اور سب سے
عجیب تر یہ ہے کہ محمدؐ (وہ محمدؐ جو بت شکن اور دشمن اصنام تھا)
لوگوں کو اپنے طلائی بت کی پرستش کی دعوت دیتا تھا"۔

اسپین میں جب عیسائی مسلمانوں پر غالب آئے۔ اور ان کو سرقوسطہ کی دیواروں تک ہٹا دیا، تو مسلمان لوٹ کر آئے اور اپنے بتوں کو انہوں نے توڑ ڈالا۔ اس عہد کا ایک شاعر کہتا ہے "اپلین مسلمانوں کا دیوتا وہاں ایک غار میں تھا۔ اس پر وہ پل پڑے اور اس کو نہایت سخت سست کہا اور اس کو گالیاں دیں اور اس کے دونوں ہاتھ باندھ کر ایک ستون پر اس کو سولی دی اور اس کو پاؤں سے روندا اور لاٹھیوں سے مار مار کر اس کے ٹکڑے کر ڈالے۔ اور ماہوم کو (جو ان کا دوسرا دیوتا تھا) ایک گڑھے میں ڈال دیا۔ اس کو سور اور کتوں نے نوچ ڈالا۔ اس سے زیادہ اس سے پہلے کسی دیوتا کی تحقیر نہیں ہوئی۔ اس کے بعد ہی مسلمانوں نے اپنے گناہوں سے توبہ کی اور اپنے دیوتاؤں سے معافی مانگی۔ اور از سر نو تلف شدہ بتوں کو بنایا۔ اسی بنا پر جب شہنشاہ چارلس سرقوسطہ میں داخل ہوا تو اس نے اپنے ہمراہیوں کو حکم دے دیا کہ تمام شہر کا چکر لگائیں۔ وہ مسجدوں میں گھس گئے اور لوہے کے ہتوڑوں سے ماہومیڈ اور تمام بتوں کو توڑ ڈالا۔

ایک دوسرا شاعر رچپر خدا سے دعا کرتا ہے کہ "وہ ماہوم کے بت کے پجاریوں کو شکست نصیب کرے" اس کے بعد وہ امرا کو جنگ صلیبی کے لئے ان الفاظ میں آمادہ کرتا ہے۔ "اٹھو اور ماہومیڈ اور ٹرگامان کے بتوں کو اوندھا کر دو۔ اور ان کو آگ میں ڈال دو۔ اور ان کو اپنے خداوند کی نذر کر دو"۔ (۱)

اس قسم کے خیالات ایک مدت تک قائم رہے۔ (کسی اور حصہ میں ہم اس کو مفصل لکھیں گے)

سترہویں اور اٹھارہویں صدی

سترہویں صدی کے سنین وسطیٰ یورپ کے عصر جدید کا مطلع ہے۔ یورپ کی جد و جہد۔ سعی د کوشش اور

(۱) ترجمہ کتاب ہنری دی کاستری بہ زبان عربی مطبوعہ مصر از ص ۸ تا ۱۰

حریت و آزادی کا دور، اسی عہد سے شروع ہوتا ہے، ہمارے مقصد کی جو چیز اس دور میں پیدا ہوئی وہ مستشرقینِ یورپ کا وجود ہے، جن کی کوشش سے نادرالوجود عربی کتابیں ترجمہ اور شائع ہوئیں، عربی زبان کے مدارس، علمی و سیاسی اغراض سے جا بجا ملک میں قائم ہوئے، اور اس طرح وہ زمانہ قریب آتا گیا کہ یورپ اسلام کے متعلق خود اسلام کی زبان سے کچھ سن سکا۔

اس دور کی خصوصیتِ اول یہ ہے کہ سنے سنائے عامیانہ خیالات کے بجائے کسی قدر تاریخ اسلام و سیرت پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بنیاد عربی زبان کی تصانیف پر قائم کی گئی، گو موقع بہ موقع معلومات سابقہ کے مصالح کے استعمال سے بھی احتراز نہیں کیا گیا۔

اس دور سے چونکہ یورپ نے مذہبی اشخاص کے شکنجہ سے نجات پائی اور اس کے مذہبی اور سیاسی امور الگ الگ ہو گئے، اس بنا پر اسلام کے متعلق مصنفین کی دو ۲ جماعتیں الگ ہو گئیں، عوام اور مذہبی اشخاص اور محقق و غیر متعصب گروہ، اسلام کے متعلق ان دونوں جماعتوں نے جو کوششیں کیں وہ آج ہمارے سامنے ہیں۔

اس عہد میں عربی زبان کی تاریخی تصنیفات کا ترجمہ ہو گیا تھا، اس سلسلہ میں سب سے پہلے ارپی نیوس (Arp) مارگولیوس (Margoliouth) ایڈورڈ پوکاک (Pococke) اور ہاٹنجر (Hattinjer) ذکر کے قابل ہیں، یہ عجیب بات ہے کہ اتفاقاً یا قصداً ان مستشرقین نے ابتداءً جن عربی تاریخوں کا ترجمہ کیا، وہ اکثر ان مسیحی مصنفین کی تصنیفات تھیں، جو قرون ماضیہ میں اسلامی ممالک کے باشندے تھے، یعنی سعید بن بطریق اوٹیکوس المتوفی ۹۳۹ء جو اسکندریہ کا پیٹریارک تھا، اور ابن العمید المکین المتوفی ۱۲۷۳ء جو سلاطینِ مصر کا ایک درباری تھا، اور ابوالفرج ابن العبری الملطی المتوفی ۱۲۸۶ء مصنف تاریخ الدول۔

ابن العمید المکین کی تاریخ، طبری اور ذیل طبری کا خلاصہ ہے، ارپی نیوس نے جو ہولینڈ کا ایک مستشرق تھا، لاطینی ترجمہ کے ساتھ لیڈن سے اس کا ایک ٹکڑا شائع کیا، جو ابتدائے رسالت سے دولت اتابکیہ تک کے واقعات پر مشتمل ہے، المکین کے نام سے اس کتاب کے حوالے یورپ کی ابتدائی اسلامی تصنیفات میں نہایت کثرت سے آتے ہیں۔

اخیر اٹھارہویں صدی

یہ وہ زمانہ ہے جب یورپ کی قوت سیاسی، اسلامی ممالک میں پھیلنی شروع ہو گئی، جس نے "اورینٹلسٹ" کی ایک کثیر التعداد جماعت پیدا کر دی، جنہوں نے حکومت کے اشارہ سے السنۂ مشرقیہ کے مدارس کھولے، مشرقی کتب خانوں کی بنیادیں ڈالیں، ایشیاٹک سوسائٹیاں قائم کیں، مشرقی تصنیفات کی طبع و اشاعت کے سامان پیدا کئے اور ینٹل تصنیفات کا ترجمہ شروع کیا۔

سب سے پہلے ہولینڈ نے اپنے مقبوضہ جزائر مشرقی میں ۱۷۷۸ء میں ایک ایشیاٹک

سوسائٹی قائم کی۔ اس کی تقلید میں انگریزوں نے بہ مقام کلکتہ ۱۷۸۴ء میں جنرل ایشیاٹک سوسائٹی اور ۱۷۸۸ء میں بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی۔ اس کے بعد ۱۷۹۵ء میں فرانس نے مشرقی زندہ زبانوں (عربی، فارسی، ترکی) کا دارالعلوم قائم کیا اور آخر کار ان مدارس اور سوسائیٹیوں کی تقلید سے تمام ممالک یورپ میں اس قسم کی درسگاہیں اور انجمنیں جاری ہو گئیں۔ عام یونیورسٹیوں میں عربی زبان کے پروفیسروں اور کتب خانوں کا وجود لازمی سمجھا جانے لگا۔

مسلمانوں کے ہاں عربی زبان میں سیرت و مغازی کی جو کتابیں محفوظ تھیں، وہ ایک ایک کر کے باستثنائے چند اٹھارہویں صدی کے اواخر سے لے کر انیسویں صدی کے اختتام تک یورپ میں چھپ گئیں۔ اور ان میں اکثر کا یورپین زبانوں میں ترجمہ ہو گیا۔ سب سے پہلے رسک (Reiske) المتوفی ۱۷۷۴ء نے تاریخ ابوالفداء مع ترجمہ لاطینی و حواشی پانچ جلدوں میں شائع کیں۔ ۱۸۰۹ء میں کیپٹن اے متھوس (A.N.Mathews) نے کلکتہ سے مشکوٰۃ المصابیح کا انگریزی میں ترجمہ شائع کیا۔ ۱۸۵۶ء میں وان کریمر (Kremer) نے کلکتہ میں محمد بن عمر واقدی کی کتاب المغازی طبع کرائی۔ ۱۸۶۰ء میں ابن ہشام کی مشہور تصنیف سیرۃ الرسول کی کوٹنگن (Cottingen) سے اشاعت کی۔ اس کے علاوہ اسی مستشرق نے سمہودی کی تاریخ مدینہ اور ابن قیتبہ کی تاریخِ معارف طبع کرائی۔ ۱۸۶۴ء میں ڈاکٹر ویل (G.Weil) نے ابن ہشام کا جرمنی میں ترجمہ کیا۔ ۱۸۷۷ء میں پیرس سے مسعودی کی تاریخ مروج الذہب مع ترجمہ فرانسیسی پروفیسر ڈی مانیارڈ نے شائع کی۔ والہوسن (Wellhausen) نے ۱۸۸۲ء میں واقدی کا جرمن ترجمہ بعنوان "محمد بہ مدینہ" برلن سے شائع کیا۔ ۱۸۸۳ء میں لیڈن سے باوٹسما (Houtasma) کے اہتمام سے یعقوبی کی تاریخ دو ۲ جلدوں میں چھپی۔ ۱۸۷۹ء سے ۱۸۹۲ء تک چودہ برس کی محنت میں طبری کی مشہور اور نادرالوجود تاریخ بارتھ (J.Barth) اور نولدیکی (Noldeke) وغیرہ نے شائع کی۔ اور سب سے آخر میں مشہور جرمن مستشرق پروفیسر سخاؤ (Sachau) کی خاص کوشش اور دیگر سات مستشرقین کی اعانت سے ابن سعد کی عظیم الشان اور نادرالوجود طبقات، جس سے زیادہ مبسوط سیرت نبوی میں کوئی تصنیف نہیں، تقریباً ۱۹۰۰ء سے گذشتہ سال تک ایک ایک جلد کر کے لیڈن سے شائع ہوتی رہی۔

ان اصل تاریخی تصنیفات اور ان کے تراجم کی اشاعت، ممالک اسلامیہ اور یورپ کے تعلقات، مذہبی منافرت کی کمی اور آزادانہ تحقیقات کی خواہش، ان تمام چیزوں نے یورپ میں مصنفین تاریخ اسلام اور سوانح نگارانِ پیغمبر عرب (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ایک کثیر التعداد گروہ پیدا کر دیا۔

اوکسفورڈ کا ایک عالم اس غیر مختتم سلسلہ کا ان الفاظ میں اعتراف کرتا ہے:۔

"محمد کے سوانح نگاروں کا ایک وسیع سلسلہ ہے، جس کا ختم ہونا غیر ممکن ہے

لیکن اس میں جگہ پانا قابل فخر چیز ہے ۔ (۱)

ہم اس موقع پر صرف ان تصنیفات کا مختصر سا نقشہ درج کرتے ہیں جو بہ تخصیص آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حالات میں یا اسلام کے اصول عقائد پر لکھی گئیں، اور جن میں سے اکثر ہمارے دفتر تصنیف میں موجود ہیں، یا ہم ان سے متمتع ہو چکے ہیں۔

نمبر	نام مصنف	وطن	نام تصنیف یا مضمون	زمانہ تصنیف
۱	ڈاکٹر جی ۰ بی (؟)	انگلستان	سیرت محمد خادع (نعوذ باللہ)	۱۸۱۵ء
۲	ڈاکٹر وایٹ (White) واعظ اوکسفورڈ	"	بیمفٹن سرمنز اسلام اور پیغمبر اسلام پر	اوائل ۱۸۰۰ء
۳	گارڈفری ہگنس ایم آر اے ۰ ایس (Godfrey Higgins)	"	اپالوجی	۱۸۲۹ء
۴	ڈاکٹر جے اے ۰ مولر (Muller)	جرمن	اسلامزم	۱۸۳۰ء
۵	گارسن ڈی ٹاسی (Garcin De Tossy)	فرانس	اسلام و قرآن	از ۱۸۳۱ء تا ۱۸۶۴ء
۶	ایڈورڈ لین (Edward Lane)	انگلستان	انتخابات القرآن	۱۸۴۳ء
۷	ڈاکٹر ویل (Weil)	جرمن	ترجمہ و تحشیہ ابن ہشام و کتاب محمد پیغمبرؐ	۱۸۴۵ء تا ۱۸۴۶ء
۸	کارلائل (Corlyle)	انگلستان	ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ	۱۸۴۶ء
۹	کوسن ڈی برسیوال (Caussin De Perceval)	فرانس	تاریخ عرب	۱۸۴۷ء
۱۰	واشنگٹن ارونگ (W.Irving)	انگلستان	سیرت محمدؐ	۱۸۴۹ء
۱۱	ڈاکٹر اسپرنگر (Springer)	جرمن	سیرت محمدؐ	۱۸۵۱ء
۱۲	وان کریمر (VonKremer)	"	ترجمہ و تحشیہ واقدی	۱۸۵۶ء
۱۳	مضمون نگار نیشنل ریویو	انگلستان	مضمون "محمد"	۱۸۵۸ء
۱۴	ڈوزی (Dozy)	ہولینڈ	تاریخ اسلام	۱۸۶۱ء
۱۵	مضمون نگار نیشنل ریویو	انگلستان	بزرگ ترین عرب	۱۸۶۱ء

(۱) مارگولیتھ: محمد، دیباچہ، صفحہ ۱۔

نمبر	نام مصنف	وطن	نام تصنیف یا مضمون	زمانۂ تصنیف
۱۶	ڈی لین (Delane)		سیرت محمدؐ	۱۸۶۱ء
۱۷	میور (Muir)	انگلستان	سیرت محمدؐ	۱۸۶۱ء
۱۸	برتھالمی سینٹ ہلیر (Hilaire)	فرانس	محمدؐ و قرآن	۱۸۶۵ء
۱۹	نولدیکی (NoldeKy)	جرمن	مضامین قرآن و اسلام	۱۸۶۹ء
۲۰	دو شیف مضمون نگار کوارٹرلی ریویو	انگلستان	اسلام	۱۸۶۹ء
۲۱	مضمون نگار برٹش کوارٹرلی ریویو	"	محمدؐ	۱۸۷۲ء
۲۲	جولیس چارلس (JuliusCharles)	فرانس	تاریخ بانیِ اسلام	۱۸۷۴ء
۲۳	مضمون نگار کانٹمپریری ریویو	انگلستان	محمدؐ اور اسلام	۱۸۷۵ء
۲۴	باسورتھ سمتھ (BosworthSmith)	"	"	"
۲۵	سیدیو (Sediliot)	فرانس	تاریخ عرب	۱۸۷۷ء
۲۶	ولہوسن (Wellhousen)	جرمن	تبصرہ بر واقدی	۱۸۸۲ء
۲۷	ابل کرابل (Krehl)	جرمنی	سیرت محمدؐ	۱۸۸۴ء
۲۸	گولڈزیہر (Goldziher)		مطالعۂ اسلام	۱۸۹۰ء
۲۹	رینان (Renan)	فرانس	تاریخ مذاہب	۱۸۹۲ء
۳۰	اچ. گریم (Grimme)	ہولینڈ	سیرت محمدؐ	۱۸۹۴ء
۳۱	ہنری دی کاستری (Henri deCastery)	فرانس	اسلام پر خیالات	۱۸۹۶ء
۳۲	ایف بوہل (Buhl)	ہولینڈ	سیرت محمدؐ	۱۹۰۳ء
۳۳	والسٹن (Wallaston)	انگلینڈ	آدھ گھنٹۂ محمدؐ کے ساتھ	۱۹۰۵ء
۳۴	مارگولیتھ (Margoliouth)	"	محمدؐ	"
۳۵	کوئل (Koell)	"	محمدؐ اور اسلام	۱۸۹۴ء
۳۶	پرنس کاتیانی Caetani	ایٹالیہ	تاریخ کبیر محمدؐ و اسلام و سلاطین اسلام	جاری
۳۷	میجر لیونارڈ (Leonard)	انگلینڈ	اسلام کا روحانی و اخلاقی پایہ	۱۹۰۹ء

مصنفین یورپ کی تین قسمیں

مصنفین یورپ تین قسموں میں منقسم کئے جا سکتے ہیں۔

(۱) جو عربی زبان اور اصل ماخذوں سے واقف نہیں۔ ان لوگوں کا سرمایۂ معلومات اوروں کی تصنیفات اور تراجم ہیں۔ ان کا کام صرف یہ ہے کہ اس مشتبہ اور ناکامل مواد کو قیاس اور میلانِ طبع کے قالب میں ڈھال کر دکھائیں، تعجب ہوتا ہے کہ ان میں بعض (مثلاً گبن صاحب) ایسے صائب الرائے اور انصاف پرست ہیں کہ راکھ کے ڈھیر میں بھی سونے کے ذرے نکال سکتے ہیں، لیکن قلیل ماھم

(۲) عربی زبان اور علم ادب و تاریخ و فلسفۂ اسلام کے بہت بڑے ماہر ہیں، لیکن مذہبی لٹریچر اور سیرت کے فن سے ناآشنا ہیں۔ ان لوگوں نے سیرت یا مذہب اسلام پر کوئی مستقل تصنیف نہیں لکھی، لیکن ضمنی موقعوں پر عربی دانی کے زعم میں اسلام پر یا شارع اسلامؐ کے متعلق نہایت دلیری سے جو کچھ چاہتے ہیں لکھ جاتے ہیں۔ مثلاً جرمن کا مشہور فاضل ساخو جس نے طبقات ابن سعد شائع کی ہے۔ اس کی وسعت معلومات اور عربی دانی سے کون انکار کر سکتا ہے۔ بیرونی کی کتاب الہند کا دیباچہ اس نے جس تحقیق سے لکھا ہے رشک کے قابل ہے، لیکن اسی دیباچہ میں اسلامی امور کے متعلق ایسی باتیں لکھ جاتا ہے جس کو پڑھ کر بھول جانا پڑتا ہے کہ وہ وہی محترم شخص ہے جس کو ابھی ہم نے دیکھا تھا، نولدیکی (جرمنی) نے قرآن مجید کا خاص مطالعہ کیا ہے، لیکن انسائیکلوپیڈیا (جلد ۱۶) میں قرآن پر اس کا جو آرٹیکل ہے، جا بجا نہ صرف اس کے تعصب، بلکہ اس کی جہالت کے رازِ پنہاں کی بھی پردہ دری کرتا ہے۔

(۳) وہ مستشرقین جنہوں نے خاص اسلامی اور مذہبی لٹریچر کا کافی مطالعہ کیا ہے، مثلاً پامر صاحب یا مارگولس صاحب۔ ان سے ہم بہت کچھ امید کر سکتے تھے، لیکن باوجود عربی دانی، کثرت مطالعہ، تفحصِ کتب کے ان کا یہ حال ہے کہ ع

دیکھتا سب کچھ ہوں لیکن سوجھتا کچھ بھی نہیں

مارگولیوس نے مسند امام احمد بن حنبل کی ۶ ضخیم جلدوں کا ایک ایک حرف پڑھا ہے، اور ہم دعویٰ سے کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے زمانہ میں کسی مسلمان کو بھی اس وصف میں اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں ہو سکتا، لیکن پروفیسر موصوف نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سوانح عمری پر جو کتاب لکھی ہے، دنیا کی تاریخ اس سے زیادہ کوئی کتاب، کذب و افتراء اور تادیل و تعصب کی مثال کے لئے پیش نہیں کر سکتی۔ اس کا اگر کوئی کمال ہے تو یہ ہے کہ سادہ سے سادہ اور معمولی سے معمولی واقعہ کو جس میں برائی کا کوئی پہلو پیدا نہیں ہو سکتا صرف اپنی طباعی کے زور سے بدمنظر بنا دیتا ہے۔

ڈاکٹر اسپرنگر جرمنی کے مشہور عربی داں ہیں، کئی سال مدرسہ عالیہ کلکتہ کے پرنسپل رہے، لکھنؤ میں آکر شاہی کتب خانہ کی رپورٹ لکھی جو ہماری نظر سے گذری ہے، حافظ ابن حجر کی کتاب الاصابہ فی احوال الصحابہ، اول اول ان ہی نے تصحیح کر کے کلکتہ میں چھپوائی، لیکن جب آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سوانح عمری پر ایک مستقل ضخیم کتاب ۳ جلدوں میں لکھی تو ہم حیرت زدہ ہو کر رہ گئے۔ (۱)

یورپین مصنفین کی غلط کاریوں کے اسباب

یورپین مصنفوں کی غلط کاریوں کی بڑی وجہ تو ان کا مذہبی اور سیاسی تعصب ہے، لیکن بعض وجوہ اور بھی ہیں جن کی بنا پر ہم ان کو معذور رکھ سکتے ہیں۔

۱۔ سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کا تمام تر سرمایہ، استناد صرف سیرت و تاریخ کی کتابیں ہیں، مثلاً مغازی واقدی، سیرت ابن ہشام، سیرت محمد بن اسحاق، تاریخ طبری وغیرہ اور یہ ظاہر ہے کہ کوئی غیر مسلم شخص اگر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سوانح عمری مرتب کرنا چاہے گا تو عام قیاس یہی رہبری کرے گا کہ اس کو تصنیفات سیرت کی طرف رجوع کرنا چاہیئے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ سیرت کی تصنیفات میں سے ایک بھی نہیں جو استناد کے لحاظ سے بلند رتبہ ہو، چنانچہ اس کی بحث اوپر گذر چکی ہے۔ مصنفین سیرت سے قطع نظر، سیرت کی روایتیں زیادہ تر جن لوگوں سے مروی ہیں مثلاً سیف، سرّی، ابن سلمہ، ابن نجیح عموماً ضعیف الروایہ ہیں اس لئے عام اور معمولی واقعات میں ان کی شہادت کافی ہو سکتی ہے، لیکن وہ واقعات جن پر مہتم بالشان مسائل کی بنیاد قائم ہے، ان کے لئے یہ سرمایہ بے کار ہے۔

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سوانح عمری کے یقینی واقعات وہ ہیں جو حدیث کی کتابوں میں بہ روایات صحیح منقول ہیں، یورپین مصنفین اس سرمایہ سے بالکل بے خبر ہیں، اور ایک آدھ کوئی ہے (مثلاً مارگولیس) تو اولادہ اس فن کا ماہر نہیں، اور ہو بھی تو تعصب کی ایک چنگاری سیکڑوں خرمن معلومات کو جلانے کے لئے کافی ہے۔

۲۔ دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ یورپ کے اصول تنقیح شہادت اور ہمارے اصول تنقیح میں سخت اختلاف ہے، یورپ اس بات کو بالکل نہیں دیکھتا کہ راوی صادق ہے یا کاذب، اس کے اخلاق و عادات کیا ہیں؟ حافظہ کیسا ہے؟ اس کے نزدیک یہ تحقیق و تدقیق نہ ممکن ہے، نہ ضروری ہے، وہ صرف یہ دیکھتا ہے کہ راوی کا بیان بجائے خود قرائن اور واقعات کے تناسب سے مطابقت رکھتا ہے یا نہیں؟ فرض کرو، ایک جھوٹے سے جھوٹا راوی ایک واقعہ بیان کرتا ہے جو قرائن موجودہ اور گرد و پیش کے واقعات کے لحاظ سے صحیح معلوم ہوتا ہے، بیان بالکل مسلسل ہے اور کہیں سے نہیں اکھڑتا تو یورپ کے مذاق کے موافق واقعہ کی صحت تسلیم کر لی جائے گی۔

(۱) یہ کتاب جرمن زبان میں ہے، میں جرمن نہیں جانتا، لیکن اس کے اقوال اکثر اور مصنفین نے نقل کئے ہیں اور وہ ہماری نظر سے گذرے ہیں۔

بخلاف اس کے مسلمان مورخ اور خصوصاً محدثین اس کی پروا نہیں کرتے کہ خود روایت کی کیا حالت ہے، بلکہ سب سے پہلے وہ دیکھتے ہیں کہ "اسماے رجال" کے دفتر تحقیقات میں اس شخص کا نام ثقہ لوگوں کی فہرست میں درج ہے یا نہیں، اگر نہیں ہے تو ان کے نزدیک اس کا بیان بالکل ناقابل اعتنا ہے، بخلاف اس کے اگر ثقہ راوی نے کوئی واقعہ بیان کیا تو گو قرائن اور قیاسات کے خلاف ہو، اور گو بظاہر عقل کے مطابق بھی نہ ہو، لیکن اس کی روایت قبول کرلی جائے گی۔

اس اختلاف اصول نے یورپین تصنیفات پر بہت بڑا اثر پیدا کیا ہے، مثلاً اہلِ یورپ واقدی کے بیان پر سب سے زیادہ اعتماد کرتے ہیں، جس کی وجہ یہ ہے کہ واقدی کا بیان نہایت مسلسل اور مربوط ہوتا ہے، جزئیات کی تمام کڑیاں باہم ملتی چلی جاتی ہیں، واقعات میں کہیں خلا نہیں ہوتا، جو چیزیں کسی واقعہ کو دلچسپ بنا سکتی ہیں، سب موجود ہوتی ہیں۔

لیکن سچ یہ ہے کہ یہی باتیں اصلی راز کی پردہ دری کرتی ہیں، جو روایتیں سو برس سے زیادہ تک محض زبانوں پر رہیں، ان میں اس قدر استقصائے جزئیات ممکن نہیں، یہ البتہ ہو سکتا ہے کہ جس طرح تاریخی افسانے لکھے جاتے ہیں، چند واقعات کا ذخیرہ سامنے رکھ کر قیاس و قرائن اور معلومات عامہ کے ذریعہ سے ایک سادہ خاکہ کو نقش و نگار سے کامل کر دیا جائے، لیکن یہ جراءت صرف واقدی کر سکتا ہے، محدثین اس سے معذور ہیں۔

تاہم اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ ہر موقع پر محض راوی کا ثقہ ہونا کافی نہیں، ثقات بھی غلطی کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں، اس لئے ضرورت ہے کہ درایت کے جو اصول محدثین نے قائم کئے ہیں، اور جن کو بعض جگہ وہ بھول جاتے ہیں، ان کی نہایت سختی کے ساتھ پابندی کی جائے۔

یورپین تصنیفات کے اصول مشترکہ

یورپین مصنفین، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اخلاق کے متعلق جو نکتہ چینیاں کرتے ہیں، یا ان کی تصنیفات سے جو نکتہ چینیاں خود بخود ناظرین کے دل میں پیدا ہوتی ہیں، حسب ذیل ہیں۔

(۱) آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زندگی مکہ معظمہ تک پیغمبرانہ زندگی ہے، لیکن مدینہ جاکر جب زور و قوت حاصل ہوتی ہے تو دفعۃً پیغمبری بادشاہی سے بدل جاتی ہے، اور اس کے جو لوازم ہیں، یعنی لشکر کشی، قتل، انتقام، خونریزی خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔

(۲) کثرت ازدواج اور میل الی النساء۔

(۳) مذہب کی اشاعت جبر و زور سے۔

(۴) لونڈی غلام بنانے کی اجازت اور اس پر عمل۔

(۵) دنیا داروں کی سی حکمت عملی اور بہانہ جوئی۔

اس بنا پر ہماری کتاب کے ناظرین کو، تمام واقعات میں اس نکتہ پر نظر رکھنی چاہیئے، کہ یہ اعتراضات تاریخی تحقیقات کے معیار پر ٹھیک اتر سکتے ہیں یا نہیں۔

اس کتاب کی تصنیف و ترتیب کے اصول

ہم نے اس کتاب میں جو اصول اختیار کئے ہیں، اب ان کے بتانے کا وقت آگیا ہے۔

(۱) سب سے پہلے یہ کہ سیرت کے واقعات کے متعلق جو کچھ قرآن مجید میں مذکور ہے، ان کو سب پر مقدم رکھا ہے، یہ قطعاً ثابت ہے کہ بہت سے واقعات کے متعلق خود قرآن مجید میں ایسی تصریحات یا اشارے موجود ہیں جن سے اختلافی مباحث کا فیصلہ ہو جاتا ہے، لیکن لوگوں نے آیات قرآنی پر اچھی طرح نظر نہیں ڈالی، اس لئے وہ مباحث غیر منفصل رہ گئے۔

(۲) قرآن مجید کے بعد حدیث کا درجہ ہے، احادیث صحیحہ کے سامنے سیرت کی روایتیں نظر انداز کر دی ہیں، جو واقعات بخاری و مسلم وغیرہ میں مذکور ہیں؛ ان کے مقابلہ میں سیرت یا تاریخ کی روایت کی کوئی ضرورت نہیں، ارباب سیر کو ایک بڑی غلطی یہ ہوئی کہ وہ واقعات کو کتب حدیث میں، ان موقعوں پر ڈھونڈھتے ہیں، جہاں عنوان اور مضمون کے لحاظ سے اس کو درج ہونا چاہیئے، اور جب ان کو ان موقعوں پر کوئی روایت نہیں ملتی تو وہ کم درجہ کی روایتوں کو لے لیتے ہیں، لیکن کتب حدیث میں ہر قسم کے نہایت تفصیلی واقعات ضمنی موقعوں پر روایت میں آجاتے ہیں، اس لئے اگر عام استقرا اور تفحص سے کام لیا جائے تو تمام اہم واقعات میں خود صحاح ستہ کی روایتیں مل جاتی ہیں، ہماری اس کتاب کی بڑی خصوصیت یہی ہے کہ اکثر تفصیلی واقعات ہم نے حدیث ہی کی کتابوں سے ڈھونڈھ کر مہیا کئے، جو اہل سیر کی نظر سے بالکل اوجھل رہ گئے تھے۔

(۳) روز مرہ اور عام واقعات میں ابن سعد، ابن ہشام اور طبری کی عام روایتیں کافی خیال کی جاتی ہیں، لیکن جو واقعات کچھ بھی اہمیت رکھتے ہیں، ان کے متعلق تنقید اور تحقیق سے کام لیا ہے، اور تا امکان کدو کاوش کی ہے، اس خاص ضرورت کے لئے ہم نے پہلا کام یہ کیا کہ ابن ہشام، ابن سعد، اور طبری کے تمام رواۃ کے نام الگ انتخاب کر لئے، جن کی تعداد سیکڑوں سے متجاوز ہے، پھر اسماء الرجال کی کتابوں سے ان کی جرح و تعدیل کا نقشہ تیار کیا، تاکہ جس روایت کی تحقیق مقصود ہو، بہ آسانی ہو جائے۔

(۴) جن فروگذاشتوں کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے، جہاں تک ممکن تھا ان کی اصلاح اور تلافی کی ہے۔

کتاب کے حصے

اس کتاب کے پانچ حصے ہیں۔

پہلے حصہ میں عرب کے مختصر حالات، کعبہ کی تاریخ اور

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ولادت سے لے وفات تک عام حالات اور واقعات وغزوات ہیں، اسی حصہ کے دوسرے باب میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ذاتی اخلاق و عادات کی تفصیل ہے، آل و اولاد اور ازواجِ مطہراتؓ کے حالات بھی اسی باب میں ہیں۔

دوسرا حصہ منصب نبوت سے متعلق ہے، نبوت کا فرض، تعلیم عقائد، اوامر و نواہی، اصلاحِ اعمال اور اخلاق ہے، اس بنا پر منصبِ نبوت کے کاموں کی تفصیل اس حصہ میں کی گئی ہے، اس حصہ میں فرائضِ خمسہ اور تمام اوامر و نواہی کی ابتدا اور تدریجی تغیرات کی مفصل تاریخ اور ان کے مصالح اور حکم اور دیگر مذاہب سے ان کا مقابلہ و موازنہ ہے، اسی حصہ میں نہایت تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ عرب کے عقائد اور اخلاق و عادات پہلے کیا تھے اور ان میں کیا کیا اصلاحیں عمل میں آئیں، نیز یہ کہ تمام عالم کی اصلاح کے لئے اسلام نے کیا قانون مرتب کیا، اور کیونکر وہ تمام عالم کے لئے اور ہر زمانہ کے لئے کافی ہو سکتا ہے۔

تیسرے حصہ میں قرآن مجید کی تاریخ، وجوہ اعجاز اور حقائق و اسرار سے بحث ہے۔

چوتھے حصہ میں معجزات کی تفصیل ہے، قدیم سیرت کی کتابوں میں معجزات کا الگ باب باندھتے ہیں، لیکن آج کل تو اس کو بالکل مستقل حیثیت سے لکھنے کی ضرورت ہے، کیونکہ معجزات کے ساتھ اصل معجزہ کی حقیقت اور امکان سے بحث کرنے کی ضرورت بھی پیش آگئی ہے، البتہ جن معجزات کی تاریخ اور سنہ متعین ہے، مثلاً معراج یا تکثیر طعام وغیرہ ان کو اس سنہ کے واقعات میں لکھ دیا ہے۔

پانچواں حصہ خاص یورپین تصنیفات کے متعلق ہے، یعنی یورپ نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) اور مذہب اسلام کے متعلق کیا لکھا ہے؟ ان کا سرمایہ معلومات کیا ہے؟ تاریخی واقعات میں وہ کیونکر غلطیاں کرتے ہیں؟ مسائل اسلام کے سمجھنے میں ان سے کیا کیا غلطیاں ہوئیں؟ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اخلاق و عادات یا مسائلِ اسلام پر جو نکتہ چینیاں کی ہیں ان کے جوابات۔

یہ ضرور نہیں کہ یہ حصے اسی ترتیب سے شائع ہوں، بلکہ جس حصہ کی تیاری کے سامان فراہم ہو جائیں گے اور مرتب ہو جائے گا وہ شائع کر دیا جائے گا۔

استناد اور حوالے تاریخ اور روایت میں حوالہ اور استناد سب سے مقدم چیز ہے، اس لئے اس کے متعلق چند ضروری امور بیان کر دینے ضرور ہیں۔

(۱) صرف انہی کتابوں کا حوالہ دیا ہے، جو خود میری نظر سے گذری ہیں۔

(۲) جو واقعات کسی قدر اہم ہیں ان کے متعلق صرف صحیح حدیثوں یا مستند

تاریخی روایتوں کا حوالہ دیا ہے، لیکن عام واقعات یا غزوات کے متعلق جزئیات کی تفصیل میں محدثانہ کد و کاوش نہیں کی ہے۔

(۳) مطبوعہ کتابوں کے حوالہ میں مطبع کا نام بتا دیا گیا ہے۔ قلمی کتابوں کے متعلق تصانیفِ سیرت کی فہرست جو اوپر گذر چکی ہے، اس میں بتا دیا ہے کہ ہمارے استعمال میں کون سا نسخہ تھا۔

*** وماتوفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب ***